انتخاب مخزن

حصہ دوم

رسالہ مخزن کی دوسری نو جلدوں کا انتخاب

حسب اجازت

جناب خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لاء

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

نے

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

فہرست مضامین

گھر سے نکل کے دیکھو

شیخ

"سفر وسیلۂ ظفر ہے"۔ یہ مقولہ اگلے زمانے میں بھی سچ تھا۔ اور آج بھی سچ ہے۔
بلکہ پہلے کم تھا۔ اب زیادہ۔ پہلے افراد پر حاوی ہوتا تھا۔ اب اقوام پر حاوی ہے۔ کسی ترقی
کرتی ہوئی قوم کا نام لو۔ جو اس کے فوائد سے بے خبر ہو۔ دُنیا کی موجودہ تجارت کا
فروغ اِسی اصول پر مبنی ہے۔ جرمنی آجکل صنعت و حرفت کی ترقی میں اوّل درجے
پر شمار کیا جاتا ہے۔ کیا اُس صنعت و حرفت کا مدار محض اہلِ جرمنی کی قدردانی پر ہے؟
اِس میں شک نہیں کہ اہلِ ملک بھی اپنے مال سے بڑھ کر کسی کے مال کو نہیں سمجھتے۔
دوسرے ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں اگر جرمنی میں راہ پانے کی کوشش کریں تو وہاں کی
حکومت اُن اشیاء پر بھاری محصول لگاتی ہے۔ تاکہ مُلکی اشیاء کا مقابلہ نہ کر سکیں۔
مگر یہ وہاں کی صنعتی ترقی کا ایک جزو ہے۔ اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جزوِ قلیل۔
جزوِ اعظم بیرونی تجارت پر منحصر ہے۔ دُنیا کا کونسا گوشہ ہے جہاں جرمن ساخت
کا مال نہیں پہنچتا۔ چین میں اس کی کھپت ہے۔ رُوم میں اِس کی قدر ہے۔ افریقہ
کی منڈیاں وہ گھیرے ہوئے ہے۔ اور ہندوستان کے بازاروں میں وہ انگریزی
ساخت کی چیزوں سے بڑھ کر چلتا ہے۔ یہاں تک کہ خود انگلستان باوصف
بڑا تجارتی مُلک ہونے کے جرمن ساخت کی اشیاء کی دستبرد سے بچ نہیں سکتا۔

اور لندن کے بازاروں میں آٹھوں کا مال جرمنی سے آیا ہُوا بکتا ہے۔ امریکہ بھی اس ترقی میں کسی سے کم نہیں اور انگلستان بھی اوّل درجے کے تجارتی ممالک میں ہے۔ اس کے سوا یورپ کے قریب قریب سب مُلک اس تجارتی لُوٹ میں جو دُنیا پر مچ رہی ہے۔ کم و بیش حصّہ دار ہیں۔ مشرقی اقوام میں سے جاپان نے حال ہی میں اس گر کو سیکھا ہے۔ اور جاپانی چیزیں بھی جابجا پھیلتی جاتی ہیں۔ اب ہندوستان کی باری ہے۔ ہاتھ کے کام میں اب بھی ہمارا وطن کسی سے کم نہیں۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ یورپ کی دوکانوں میں ہندوستان کی دستکاری مہنگے داموں بکتی تھی۔ اب مشین کا زمانہ آگیا ہے۔ اور صنعتی اور تجارتی لڑائی میں اس قوم کا جو کل کا مقابلہ ہاتھ سے کرنا چاہے۔ وہی حال ہوگا جو میدانِ جنگ میں توپ کا مقابلہ تیر و تفنگ اور بندوق کا سامنا تیغ و سنان کے ساتھ کرنے سے ہوتا ہے۔ وقت آپہنچا ہے کہ ہند جاگے اور اُس کے ساتھ اہلِ ہند کی قسمت اور ہندوستان والے دُنیا کی معزز صنعتی اور تجارتی اقوام کی مجلس میں برابر کی کرسی لیں۔ اس کا آغاز تو پہلے گھر کی خبر لینے سے ہی ہوگا۔ کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے کارخانوں سے خریدیں۔ مگر اس کا معراج یہ ہے کہ ہندوستان کا مال زمانۂ سابق کی طرح اطرافِ دُنیا میں پھیلنے لگے بیشک یہ منزل دُور ہے۔ اور دشوار بھی دکھتی ہے۔ لیکن اس کا پیشِ نظر رہنا بہر حال ضرور ہے مُسافر کی رفتار پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اور کوشش کا معیار جتنا بلند رہے مفید ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی کی تدبیریں کیا ہیں۔ تدبیریں تو مختلف ہیں۔ اور سب اپنی اپنی جگہ ضروری۔ مگر ہندیوں کا کثرت دُنیا کے دوسرے ملکوں میں پھیل جانا ان میں سے ایک تدبیر ہے جس کی اہمیت میرے دل پر روز بروز نقش ہوتی جاتی ہے۔ صنعتی تعلیم کے لئے سفر درکار ہے۔ تجارتی تعلقات بڑھانے کے لئے سفر درکار ہے۔ محنت مزدوری کے ذریعے ڈھونڈنے کے لئے سفر درکار ہے۔ مگر ان کے علاوہ بعض اور فوائد دوسرے ممالک میں ہندیوں کے قیام پذیر رہنے سے وابستہ ہیں۔ جن کا احساس وطن میں کم ہوتا ہے اور زیادہ تر وطن کے باہر ہی ہو سکتا ہے۔ دوسری قوموں کے

اوضاع و اطوار دیکھنے سے خیالات میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جو نہایت قابل قدر ہے اور جب کسی ملک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو ملکوں باہر گئے ہیں اور جنہوں نے اپنے ہاں کی ہوا کے سوا اور مقامات کی بھی ہوا کھائی ہے۔ تو نامعلوم طور پر ایک قسم کا تغیر ملک کے حالات اور خیالات میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ جیسے میدہ پر خمیر کا اثر ہوتا ہے۔ اور بہت سی ترقیاں اور بہت سی اصلاحیں جو پہلے ناممکن نظر آتی تھیں، ممکن معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور کئی تعصبات جو پہلے سد راہ ہوتے تھے۔ راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ ہاں اس نتیجے کے مترتب ہونے کے لئے یہ ضرور ہے کہ جو لوگ سفر سے مستفید ہوں۔ وہ اس کے فوائد کے اخذ کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں اور ان میں سے بیشتر ایسا سفر کریں۔ جس کے اخراجات وہ سفر ہی سے نکالیں نہ یہ کہ سب کے سب ملک کا روپیہ باہر صرف کر آئیں۔ اب تک جو کچھ لوگ سفر یورپ کو نکلے ہیں۔ وہ عموماً یا تو طالب علمی کے لئے نکلے ہیں۔ یا محض سیاحت کے لئے۔ اور ان لوگوں کی تعداد جو تجارت کی غرض سے یورپ آئے ہیں۔ ایسی بہت کم ہے تاہم اس سلسلے کا آغاز ہی دل خوش کن ہے۔ اور ایسے اصحاب کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میری مراد سفر سے سفر یورپ ہی نہیں۔ بلاشبہ اس وقت یورپ رونق کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور صاحبان توفیق کے لئے اس کا دیکھنا خالی از لطف و فائدہ نہیں مگر میرا مدعا سفر سے عام سفر ہے۔ چین کا ہو یا جاپان کا۔ روم کا ہو یا ایران کا۔ تہذیب کے دعویدار یورپ کا ہو۔ یا تہذیب کے شدکار افریقہ کا۔ سب سے سبق مل سکتا ہے۔ سب سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی محنت اور لیاقت کے جوہر لے کے نکلے اور ہمت کی رفاقت نہ چھوڑے۔ کلکتہ اور بمبئی اور ہندوستان کے بعض اور بڑے شہروں میں ایک معقول تعداد چینیوں کی ملتی ہے۔ جو مختلف صنعتی اور تجارتی طریقوں سے روپیہ کماتے ہیں۔ اور بوٹ بنانے میں خصوصیت سے استاد ہیں۔ کیا ان کے مقابل میں چین کے کسی مقام میں ایسی یا اس کے قریب تعداد ہندی دستکاروں کی موجود ہے؟ نہیں انگریز تاجروں کو لو۔ اور ان کے کارخانوں کو دیکھو۔ جو روپیہ گورنمنٹ کے خزانے میں

ہمارے ہاں سے جاتا ہے اس کی بابت تو فریادیں ہوتی ہیں۔ کہ ہم لوٹے جا رہے ہیں۔ کیا یہ بھی گورنمنٹ کا قصور ہے کہ سب بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں۔ بہت سے بڑے کارخانے۔ قریباً سب بستیاں جو چاء۔ نیل یا قہوہ کی پیداوار کے لئے قائم ہیں۔ انگریز تاجروں کے ہاتھ میں ہیں؟ کیا اگر خود اہلِ ملک مشترکہ سرمایہ کی بڑی کمپنیاں رکھتے ہوں اور ان کاموں میں حصہ لیں اور انگریز تاجروں کے نفع میں خود بھی شریک ہوں تو کوئی اُنہیں روکتا ہے؟ چاہیئے تو یہ کہ ہر انگریز کے جواب میں جو ہندوستان میں تجارت کرکے روپیہ کماتا ہے۔ ایک ہندی تاجر انگلستان میں روپیہ کما رہا ہو۔ ہر فرانسیسی تاجر کے جواب میں ہندی کی کوٹھی فرانس میں ہو۔ ایران تجارتی اقوام کے لئے زرخیز منڈی ہے۔ جب دُور دُور سے قومیں آکر وہاں سے روپیہ کما سکتی ہیں تو ہندوستان والے جو پاس رہتے ہیں کیوں مستفید نہ ہوں۔ خلیج فارس کے سواحل پر چند جگہ ہندوستانیوں کی دُکانیں ہیں۔ کیوں اس سے زیادہ نہ ہوں۔ مُلک کے اندر کے شہروں میں کیوں ہندی تاجر گھُس نہ جائیں؟ رُوم ہم سے بہت دُور بھی نہیں اور ہمارے ابنائے وطن میں خصوصاً مسلمانوں کا تعلق بھی اُس سے گاڑھا ہے۔ روم میں ہر قوم کے تاجر ہیں۔ نہیں موجود تو ہندی ہی نہیں۔ افریقہ کے بعض حصوں میں ہندوستانی جانے لگے تھے اور کام بھی اُن کا خاصہ بن چلا تھا مثلاً جنوبی افریقہ میں۔ اور وہاں آب و ہوا بھی اچھی تھی۔ مگر وہاں فرنگی اقوام کو اِن چند آدمیوں کی کامیابی بھی کانٹے کی طرح کھٹکی اور اُنہوں نے اُن کے راستے میں بیحد دقتیں ڈالدیں اور اُن کا جانا قریب قریب بند کر دیا۔ اچھا یہ دروازہ بند ہے تو بند ہی سہی۔ اور کئی دروازے ابھی افریقہ میں کھُلے ہیں۔ وہاں گھُس جاؤ۔ اور جو دروازہ بند ہو اُس کو بھی کھٹکھٹاتے رہو۔ کبھی تو کھُلیگا ہی۔ امریکہ جنوبی کے بعض حصوں میں کچھ ہندی اچھی حالت میں۔ وہاں اِن کے خلاف تعصب بھی کم ہے۔ وہاں کچھ اور بھی کھپ سکتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اسوقت جمیع اقوامِ عالم کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی ہیں۔ جرمن سے روس سے۔ فرانس سے انگلستان سے۔ لوگ وہاں جاتے ہیں اور وہیں کے باشندے قرار پا جاتے ہیں۔

معلوم نہیں اگر بہت سے ہندوستانی وہاں جاکر بسنا چاہیں تو وہ کیا رویہ اختیار کریں لیکن تا حال اُن کا سلوک ہندوستانی سیاحوں واعظوں اور طلبہ سے بہت عمدہ ہے۔ آزادی کی سرزمین ہے۔ زرخیزی میں دُنیا کے کسی حصّے سے کم نہیں محنت مزدوری کے لئے اچھی ہے بشرطیکہ کوئی ہنر کسی کے پاس ہو۔ وہاں قسمت آزمائی کرنے والے نکلنے چاہئیں۔ کینیڈا تو سلطنت برطانیہ کا ہی حصّہ ہے۔ اور اس میں ہزاروں ایکڑ قابل زراعت زمین کے کاشتکار کے ہاتھ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں کی گورنمنٹ آئے دن انگلستان اور دیگر ممالک یورپ میں ایجنٹ بھیجتی ہے۔ کہ لوگوں کو ترغیب دے کر لاؤ۔ زمین مفت ملے گی۔ وہ آکر قابض ہو جائیں اور آباد کریں۔ آئے دن سینکڑوں جاتے ہیں۔ مگر اُدھر سے ہَل مِن مزید کی آواز بھی جاری ہے۔ کچھ ہمت ور پڑھے لکھے ہندوستانی اگر چاہیں تو عجب نہیں کہ انہیں وہی رعایات مل جائیں جو اَور آبادکاروں کو مل رہی ہیں۔ اور اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہو تو اَور زیادہ لوگ جانے لگیں بغرض اُمنگ اور جستجو شرط ہے۔ پھر اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ "پائے گدا لنگ نیست۔ ملکِ خدا تنگ نیست" ۔

اس تحریک پر اعتراض دو ہو سکتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ خود ہمارا ملک بہت وسیع ہے۔ اُس میں ابھی بہت سی زمین قابل زراعت موجود ہے اور بہت سے پیشے قابلِ تحصیل۔ سرمایہ جو باہر نکلنے کے لئے چاہیئے۔ اُس کی بھی مُلک میں بیحد ضرورت ہے۔ پھر باہر جانا کیا معنے۔ دوسرا یہ کہ آگے ہی مُلک میں کام کرنے والے کم ملتے ہیں۔ اور اگر اس طرح باہمت آدمیوں کا ایک معتدبہ حصّہ مُلک سے باہر چلا جائے تو ملک اور بھی غریب ہو جائے۔ اعتراض دونو بجا اور جاندار ہیں۔ جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ مُلک کے اندر جو ترقی ممکن ہے۔ وہ بھی ہیچکاروں پر موقوف ہے۔ لیکن اگر قوموں میں نام پیدا کرنا ہے تو قوموں سے بھی رشتہ پیدا کرنے کی بنیاد ابھی ڈال دو۔ ہندوستان میں تمہاری سب کوششیں اُن حدود سے گھری ہوئی ہیں۔ جو محکومی کے لوازم ہیں۔ باہر نکل کر نئے مُلکوں میں جو لوگ آزادی کی آب و ہوا میں زندگی بسر

کرینگے۔ اور اپنی قوتوں کا دوسری قوموں کی قوتوں سے موازنہ کریں گے۔ انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہندی کسی سے کم رہیں۔ اُن کی رائے دوسروں کی رائے پر اثر ڈالے گی۔ اُن کی مثال دوسروں کو اُبھارے گی۔ اُن کی حیثیت کا عکس دوسروں کی حیثیت پر پڑیگا۔ اگر وہ باہر اپنی قابلیت کا سکہ جما دینگے اور اپنے چلن کی خوبی کا اعتراف کرالیں گے تو ملک میں جو اُن کے بھائی ہونگے انہیں بھی اس نیکنامی کا حصّہ ملے گا۔ اس نظر سے یہ تدبیر امتحان کے قابل ہے اور یہ ایثار کر گذرنے کے لائق۔ رہا دوسرا اعتراض کہ کام کے آدمیوں سے مُلک کو خالی نہ کرنا چاہیئے۔ اِس کا علاج یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہر شخص جو باہر نکلنے کا تہیہ مُلک کی خاطر کرے وہ اس ارادے کے ساتھ ہی یہ عہد کرے جائے کہ کامیابی کے بعد وہ ممالکِ غیر کو وطن نہ بنالیگا اور اپنی عمر کا آخری حصّہ اور اپنی محنت کی کمائی مُلک کی بھلائی میں صرف کریگا۔ اور جو کسی اتفاق سے اپنے نئے وطن کا پابند ہو جائے۔ وہ اپنے وطنِ مادری سے کبھی رشتہ نہ توڑے۔ اور دُور بیٹھ کر بھی ہند کے لئے باعثِ تقویت ہے اور حق المقدور ملک کی بہتری کے لئے کوشش کرتا ہے۔ جو کام فرزندانِ انگلستان دُنیا کے دُور دراز حصّوں میں جا لینے پر بھی انگلستان کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ وہی کام ہر ہندی ہندوستان کے لئے کرتا رہے۔ اس شرط کو خیالی اور موہوم نہ سمجھنا چاہیئے۔ جب قومیں بننے لگتی ہیں اور اُن کے دِن بھلے آتے ہیں تو اُن کے عزم و ارادے میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کے افراد گھر سے جو ارادہ کر کے نکلتے ہیں اُس سے کبھی نہیں ٹلتے۔

پس اگر حُبِ وطن کا ہندیوں پر یہ اثر ہو کہ وہ اپنا گھر گھسنا پن چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے۔ نئے مقامات میں رزق ڈھونڈھنے کی مشکلات کا سامنا کرنے اور زیادہ کامیاب اقوام کے ہاتھوں طرح طرح کی ذلتیں سہنے نکلیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ وہ وطن سے نکل کر وطن کو یاد رکھیں اور اپنی فتح اور کامیابی کی گھڑیوں میں بھی اس کے حق سے غافل نہ ہوں۔ اگر ڈھب کے آدمی نکلنے لگیں تو تجارت۔ زراعت۔ صنعت اشاعت مذہب۔ کئی اسباب تحریک کے لئے موجود ہیں۔ موجودہ حالت کے مصداق

مجھے دو چار مصرعے سوجھے ہیں لکھے دیتا ہوں۔ شاعر ہوتا تو اس لمبی تحریر کی بجائے ایک مختصر اور پرزور نظم لکھ دیتا۔ جسے لوگ گاتے پھرتے۔ اب ان مصرعوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ اور اپنے سخنور احباب سے عرض کرتا ہوں ع اگر "شاعری" ایک اشارت بس است۔

بخت آزمانے نکلو جنگل بسانے نکلو

کڑیاں اُٹھانے نکلو جانیں لڑانے نکلو

گھر سے نکل کے دیکھو۔ ہندوستان والو!

دولت کمانے نکلو حکمت اُڑانے نکلو

مذہب سکھانے نکلو ہر ہر بہانے نکلو

گھر سے نکل کے دیکھو۔ ہندوستان والو!

غرض نکلو تو سہی۔ مگر ایک شرط ملحوظ رہے۔ ایسی طرح گھر سے نہ نکلو کہ نہ گھر کے رہو نہ گھاٹ کے۔ بلکہ سامان کے ساتھ۔ جس سے اپنی عزت بڑھے۔ اور مُلک کی شان۔ ایسا نہ ہو کہ جو بالکل بے زر ہیں۔ وہ بغیر مآل کار سوچے وطن کو چھوڑ دیں۔ تجارت والے سرمایہ کا بندوبست کر کے نکلیں۔ تعلیم کے شائق پہلے گھر سے خوب پڑھ کر نکلیں۔ زراعت کے لئے جائیں تو خود اس فن سے واقف ہوں اور واقف کار آدمیوں کو ساتھ لے جائیں۔ صنعت والے اس قابل ہوں کہ چار باتیں کسی سے سیکھیں تو چار اُس کو سکھا بھی سکیں۔ جس مُلک میں جائیں اُس کی زبان پہلے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کے اوضاع و اطوار سے واقفیت بہم پہنچا لیں۔ وہاں دن بسر کریں تو اس طرح کہ معلوم ہو کہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ابنائے وطن کی عزت کا ہر وقت پاس ہے۔ اگر بڑھیں اور ان احتیاطوں کے ساتھ بڑھیں۔ تو کوئی دن میں وہ کامیابیاں جو اب اوروں کے حصے میں ہیں۔ ہمارے احاطۂ دسترس میں ہوں۔ اور یہ جو ناکامیوں کی شکایت اب ہے۔ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ لندن میں ہزارہا یہودی رُوس سے آتے ہیں اور وہاں کاروباری بن جاتے ہیں۔ چند سال کے بعد انگریزوں کے سے حقوق حاصل کرتے ہیں اور ان کی اولاد ہر اعتبار سے انگریز کا حکم رکھتی ہے۔ فرانسیسی جرمنی۔ ارمنی۔ یونانی

اطالیہ کے باشندے۔ ہسپانیہ کے باشندے۔ آسٹریا کے رہنے والے۔ روس کے ساکن۔ غرض ہر مُلک کے قائم مقام انگلستان کے بڑے شہروں میں روزی کما رہے ہیں۔ اور محروم ہیں تو ہم جن کا اتنا حق انگلستان پر ہے اور جن سے انگلستان کو بیشمار نفع پہنچتا رہتا ہے۔ یہی حال کم بیش سلطنتِ برطانیہ کے دیگر حصص اور امریکہ وغیرہ میں ہے۔ اور جُوں جُوں اس کیفیت کو ہم بچشم خود دیکھتے ہیں۔ دل کُڑھتا ہے اور یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے ہموطن بھی نکل پڑیں اور اس خوانِ یغما میں شریک ہوں ؎

سخن درست بگویم نمے توانم دید کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

(عبدالقادر)

کشتی اور طُوفان

وہ دردناک نظارہ مشکل سے بھُولے گا۔ جب مَیں نے ایک دن کشتی اور اُس کی سواریوں کو۔ ساحل کے قریب۔ ہزار ہا لوگوں کے پیشِ نظر۔ طُوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے عاجز آکر۔ ڈُوبتے دیکھا +

فرانس کا شمالی ساحل تھا۔ اور اتوار کا دن۔ ہزاروں تماشائی زن و مرد ساحل کے قریب اونچے بند پر بیٹھے طُوفان اور تلاطم دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کی حالت تو سمندر کے منظر کو دلکشا ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو۔ لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُر شوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ سبکسارانِ ساحل میں ہوں۔ مگر یہ دلچسپی اُسی وقت تک ہے کہ سامنے سمندر ہی سمندر رہو۔ کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طُوفان کے پنجے میں نہ ہو۔ ورنہ فوراً سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں۔ اور دلوں سے دُعائیں بے اختیار اُٹھتی ہیں۔ کہ الٰہی اِن جانوں کی خیر ہو جو اس پُر شور حالت میں توکّل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہوئے ہیں جس دن کا مَیں ذکر کرتا ہوں۔ اُس

دن سمندر زوروں پر تھا۔ موجیں بلیوں اُچھلتی تھیں اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری ساری خشکی طے کر کے بند سے آ کر ٹکراتا تھا اور اِس طرح اُچھلتا تھا کہ بند کے اوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی۔ اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اِن کے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ لیکن تعطیل کا دن۔ فراغت کا زمانہ۔ سمندر کی یہ بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر اپنا دست گستاخ بڑھاتا تھا تو کئی اور مشتاق ہاتھ بچانے دوڑتے تھے۔ اور چھتری کی ڈھال سامنے کر دیتے تھے۔ اور عورت ہنستی ہوئی شکریہ ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آبِ شور سے تر ہو جاتا تھا تو عورتیں تالی بجاتی تھیں اور وہ قہقہے پڑتے تھے کہ الاماں۔ لوگ بھیگتے تھے۔ اور پرواہ نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے ٹلتا نہیں تھا۔ ایک طرف باجا بج رہا تھا اور سینکڑوں لوگ اُس کے گرد جمع تھے۔ اور جو دور تھے وہ بھی اُس کی سُریلی صداؤں کے مزے لے رہے تھے۔ کہ اچانک ایک توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی! سب حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کوئی کشتی خطرے میں ہے اور یہ توپ بندرگاہ کے اُس مینار سے چلی ہے جہاں ایک تجربہ کار بحری افسر اس نگہداشت پر متعین رہتا ہے۔ کہ نواحِ بندر میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہو تو فوراً اُس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں اور ایک بادبان پر پڑیں۔ جو اپنے کام سے عاری ہو چکا تھا۔ اور اُس سے ایک مستول پر اُتریں جو سرنگوں ہوتا جاتا تھا۔ کشتی کا ایک سرا پانی میں تھا۔ اور دوسرا پانی کے اوپر تھا۔ اور اِس طرف مستول سے مضطربانہ لپٹے ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔ سینکڑوں زن و مرد بے قراری کے ساتھ بند سے نیچے اُتر کر پانی کے قریب جانے لگے۔ اور بعض پیراک کپڑے اُتار کر پانی میں کود کے کشتی تک پہنچ کر اُس کی مدد کریں۔ تھوڑی دیر میں دو کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں جن میں وردی پوش ملاح ایک ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے اور جو عموماً سمندر کے کنارے پھرتے رہتے تھے۔ کہ اگر کوئی تیراک ناواقف بہتا ہوا دُور تک چلا جائے تو۔

غوطے کھانے لگے یا اور کوئی واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں۔ مگر موجوں کی یہ حالت تھی۔ کہ دونوں کشتیوں میں سے ایک بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمت کر کے اُس طرف کو بڑھتے تھے مگر ایک ہی موج ایسی آتی تھی کہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ اُتنے قدم بڑھنے نہیں پاتے تھے جتنے پیچھے دھکیل دیئے جاتے تھے۔ گویا سمندر زبانِ موج سے اِن پر عتاب کرتا ہُوا کہتا تھا۔ "او۔ انسانِ ضعیف کے بے ادب ہاتھو۔ ہٹو۔ اور اپنی بساط سے بڑھنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ کشتی اور اُس کی سواریاں میرا شکار ہیں اور کس کی مجال ہے کہ میرا شکار مجھ سے چھینے اور میں کیا ہوں میں بھی نہنگِ اجل کا ایک مُنہ ہوں۔ اُس نہنگ کا نوالہ اب تمہارے ہاتھ کیونکر آسکتا ہے۔" اسی طرح وہ دلاور اور ہمدرد پیراک جوا کاؤ کا کود پڑے تھے۔ لطمۂ موج سے عاجز آکر کنارے پر کھڑے بے بسی سے یہ خوفناک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کشتی بان کے کئی یار دوست جان پہچان وہیں کنارے پر موجود تھے۔ اور ہاتھ مل رہے تھے۔ مگر کیا ہوتا تھا کشتی دو چار دفعہ ڈوبی اور اُبھری۔ آخر صرف بادبان کا ایک حصہ پانی کے اوپر تھا اور باقی سب پانی کے نیچے۔ ذرا سی دیر میں وہ بادبان بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور کشتی نذرِ طوفان ہو گئی۔

اِس ہیبت ناک سین کے دیکھنے والوں کے چہرے اُس وقت دیکھنے کے لائق تھے ایک مایوسی تھی جو سب چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک رنج تھا جو سب دلوں پر مسلط تھا۔ ایک پریشانی تھی جو سب طرف آشکار تھی۔ ایسی ہی گھڑیوں میں بنی نوعِ انسان کی وہ باہمی لازوال یگانگت ثابت ہوتی ہے۔ جس سے کیا اشخاص کیا اقوام کامیابی کے نشے اور دولت کمانے کی جد و جہد میں چشم پوشی کر لیتی ہیں۔ وہاں عیسائی بھی تھے۔ اور یہودی بھی۔ انگریز بھی تھے اور فرانسیسی بھی۔ پراٹسٹنٹ بھی تھے اور کیتھالک بھی چند سیاہ فام حبشی تھے اور چند گندم گون مصری۔ مراقش اور الجزائر کے کئی تاجر اپنی سرخ ٹوپیاں پہنے کھڑے تھے۔ اور میں ایک ہندی بھی اُسی گروہ کا ایک جزو قلیل تھا۔ مگر ہر ایک نبض ایک رفتار پر تھی۔ گویا ایک نبض تھی جو ان جانوں کے اس طرح ضائع ہونے کے صدمے سے مضطربانہ حرکت میں تھی۔ ایک دوسرے سے پوچھتا تھا۔ کہ مرنے والے

کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ پہلے تو جتنے منہ تھے اتنی زبان۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا معلوم ہوا۔ کہ کشتی میں چھ آدمی تھے۔ ایک کشتی بان اور دو اس کے بچے۔ ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا اور دوسرا آٹھ نو سال کا جس کو وہ اکیلا گھر میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ شخص کشتی لئے کنارے پر بیٹھا تھا۔ کہ تین مسافر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ اُنہوں نے کہا ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو اور کشتی والوں نے انکار کیا کہ آج طوفان آرہا ہے۔ اس حالت میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ وہ مایوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پھر اور موقع نہیں ہے۔ کل واپس جانا ہے۔ یہ کشتی بان دلیر تھا۔ اُس نے کہا۔ آؤ۔ میں لے چلتا ہوں"۔ وہ ہنستے ہوئے سوار ہو لئے۔ اور کشتی چلی۔ آدمی تھا کاریگر۔ خاصی دیر تک باوجود طوفان کے چلاتا رہا۔ مگر اُس کی اس دلیری اور اُن کے اس شوق کی آڑ میں موت شکار کھیل رہی تھی۔ ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا۔ کہ کشتی اس کے قابو میں نہ رہی اور اُلٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ نہ کہیں ٹھکانا لگنا تھا۔ نہ لگا +

اب اُن آفت رسیدوں کی کہانی سنو جو سیر کرنے نکلے تھے۔ وہ تھے ایک میاں۔ ایک بی بی۔ اور ایک میاں کا بھائی۔ میاں۔ بی بی میں کچھ عرصے سے عشق صادق تھا اور آخر دونوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے۔ اتوار کا یہ حادثہ ہے۔ اور ہفتے کے دن اُنکا بیاہ ہوا تھا۔ دونوں کے ماں باپ زندہ تھے اور بیاہ ہوتے ہی یہ اُن سے ہنسی خوشی رخصت ہوئے تھے کہ اتوار کا دن دونوں کاٹ کر پیر کو گھر آجائینگے۔ ہفتے کو جب پادری اُنکے ہاتھ ملا کر اُن کو دُعا دے رہا ہوگا۔ تو اُسے معلوم ہوگا کہ وہ نکاح آسمان کیلئے باندھ رہا ہے۔ اور زمین پر اس نکاح کی مُدت چھبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر وہ چھبیس گھنٹے ایسے تھے کہ اُن پر چھبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہیئے کیونکہ اُن کا جو انجام ہوا وہ ہر چند پر درد اور غمناک ہے۔ مگر ایسا انجام ہے کہ کوئی طالب و مطلوب اس سے بڑھ کر آرزو نہیں کر سکتے۔ وہ ڈوبے تو لپٹے ڈوبے۔ شب بھر موجوں کے [illegible] سینہ سپر رہے۔ اور جب دُنیا بھر نے یہ سمجھ لیا کہ قعر سمندر میں جہاں لاکھوں بندگانِ خدا کی

بے نشان قبریں بنتی ہیں۔ ان کا بھی مزار بن چکا۔ تو اچانک سمندر کے جی میں یہ آئی کہ ان کا عشق صادق کم از کم پختہ اور مشترکہ مزار کا مستحق ہے۔ چلو۔ ان کی لاشیں اُگل دو۔ باقی سب کو تو ہضم کر گیا۔ لیکن ان دونوں کو پیر کے روز ساحل پر پھینک دیا۔ پیر کو دریا کا سکون دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ کہ کل یہیں اس زور کا طوفان تھا۔ اور جہاں کشتی ڈوبی تھی۔ اُس جگہ کے قریب خشکی ہو گئی تھی۔ وہاں دو موم کی تصویریں پڑی تھیں۔ بیوی اپنے جان نثار شوہر سے لپٹی ہوئی۔ بال چہرے پر پریشان۔ مگر صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سو رہی ہے میاں کے چہرے پر یہ سکون تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا۔ کہ جوانمرد نے موجوں سے لڑتے لڑتے جان دی ہے اور اس جدوجہد کا نقش چہرے پر یادگار رہ گیا ہے +

شناوران محبت تو سینکڑوں ہیں۔ مگر
جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

خدا کی ہستی

(عبدالقادر)

سُقراط حکیم نے سُن رکھا تھا کہ ارسطاویموس نہ قربانی کرتا ہے۔ نہ نماز و وظیفہ پڑھتا ہے۔ نہ مندروں کے پجاریوں کی وساطت سے اپنے کاروبار کی نسبت دیوی دیوتاؤں کا منشاء دریافت کرتا ہے۔ بلکہ اور لوگ جو ایسا کرتے ہیں اُن پر ہنستا ہے۔ اس لئے موقع ملنے پر اس نے ارسطاویموس کے ساتھ اس طرح پر گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

س۔ ارسطاویموس! کوئی شخص ایسے بھی ہیں۔ جن کی لیاقت کی وجہ سے تم اُن کی قدر کرتے ہو؟

ا۔ ہاں! کیوں نہیں!

س۔ بھلا اُن کے نام تو لو۔

ا۔ ہومر۔ رزم و بزم کی نظم میں۔ ملینا پدیس۔ رندانہ و مستانہ غزل خوانی میں۔ ذو فلنط۔ اندوہ ناک ناٹک میں۔ پُل قلنطس۔ بُت تراشی میں۔ ذوک سیط

نقاشی اور مصوّری میں ۔

س ۔ بھلا تم کن اُستادوں کو تحسین و آفرین کے لائق خیال کرتے ہو۔ آیا اُن کو جو بیجان اور بے رُوح صُورتیں اور مورتیں بناتے ہیں ۔ یا اُن کو جو ذی رُوح اور ذی حیات بناتے ہیں کہ اپنی مرضی سے چلتے پھرتے ہیں اور گویائی و نطق سے بہرہ ور ہیں ؟

ا ۔ بیشک آخر الذکر کو ۔ بشرطیکہ وہ عقل و شعور سے کام لیتے ہوں ۔ اور اتفاقات و حادثات کے بھروسے پر نہ بیٹھے ہوں ۔

س ۔ بعض چیزیں ہیں کہ ان کی نسبت ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیوں بنائی گئی ہیں بعض اور چیزیں ہیں کہ صریحاً اچھی اور مفید ہیں ۔ ان دونوں فریق میں سے تم کس کو عقل و شعور کا کام کہو گے اور کس کو اتفاق کا ؟

ا ۔ معقول بات تو یہ ہے کہ جو چیزیں صریحاً اچھی اور مفید ہیں ان کو عقل و شعور کا کام جانیں ۔

س ۔ تو کیا تم نہیں خیال کرتے کہ جس صانع نے آدمی کو دیکھنے کے لئے آنکھ ۔ سُننے کے لئے کان ۔ اور اور چیزوں کے جاننے کے لئے باقی حواس دیئے اس کو انسان کی مصلحت اور منفعت منظور تھی ؟ خوشبوئیں کس کام آتیں اگر ان کے آنے کی سبیل یعنی ناک نہ ہوتی ؟ حلق اور تالو کے مزے کس طرح لیتے اگر زبان میں ڈالنے کی صلاحیت اور تمیز نہ رکھی جاتی ؟ آنکھ کیسی نازک شے ہے ؟ اس کی حفاظت کے لئے پپوٹے ہیں ۔ کہ دیکھنے کے وقت کھلے رہتے ہیں اور سوتے ہی مند جاتے ہیں ۔ کیا اِس اِنتظام میں تم کو پیش بینی اور پیش بندی کا گمان نہیں گذرتا ؟ دیکھو تو سہی کس خوبی کے ساتھ پلکیں خاک دھول کو آنکھ کے اندر جانے سے روکتی ہیں اور بھویں پیشانی کے پسینے کو بہکر آنکھوں کے اندر اُترنے اور خلش کرنے سے باز رکھتی ہیں ! کس حکمت کے ساتھ کان کو بنایا ہے کہ کل آوازوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور ایک دوسرے کا سدِ راہ نہیں ہونے دیتا ۔ جانداروں کے جبڑوں کو دیکھو کہ آگے کے دانت لوالہ کترنے اور پیچھے کی داڑھیں اس کو نرم کر کے حلق سے اُترنے کے قابل بنانے کے

لیے کتنی موزوں ہیں۔ منہ کو آنکھ اور ناک کے تحت میں رکھا ہے۔ تاکہ اس کو ہدایت ہوتی ہے کہ کونسی چیز اندر لیجانے کے کام کی ہے اور کونسی نہیں ہے۔ یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ جو اشیاء حواس کو پراگندہ کرنے والی ہیں اُن کو حواس سے کتنا دُور رکھا گیا ہے۔ پس جہاں یہ احتیاط اور انتظام موجود ہے۔ وہاں تم کو اس بات کے بتانے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ آیا یہ پیش بینی کا نتیجہ ہے یا محض اتفاق و حادثات کا؟

ا۔ مجھے اس بارے میں ہرگز کوئی تامل نہیں ہے۔ میں جس قدر غور و فکر کرتا ہوں اسی قدر میری طبیعت یہ کہتی ہے کہ یہ سب کچھ کسی ایسے صانع کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہے جو نوعِ انسان کو سب سے عزیز رکھتا ہے۔

س۔ بھلا اس باب میں تمہاری کیا رائے ہے کہ اس نے ہر جاندار میں اپنی نسل کے بڑھانے کی خواہش پیدا کی ہے۔ ماں میں اولاد کی اتنی ممتا اور محبت رکھی ہے۔ اور پیدائش کے وقت سے اخیر دم تک ہر ذی حیات زندگی پر جان دیتا ہے اور موت سے جی چراتا ہے؟

ا۔ رائے کیا ہوتی۔ سوائے اس کے کہ اُس نے اِن کی ذات اور نوع کے قیام کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے؟

س۔ بس یہیں تو خاتمہ نہیں ہو گیا۔ ابھی چلے چلو جواب دیئے جاؤ۔ شاید تم ہی مجھ سے کوئی سوال پوچھنے لگو۔ مجھے یقین ہے اس بات سے تو تم بے خبر نہیں ہو کہ تم کو عقل و شعور عطا کیا گیا ہے۔ پھر کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اور کوئی صاحبِ عقل و شعور کہیں ہے ہی نہیں؟ ذرا سوچو۔ تمہارا بدن ایک مٹھی خاک ہے اس تودہ عظیم کی جو تمہارے سامنے موجود ہے۔ وہ نمی جس سے یہ مٹی خمیر ہوئی ہے ایک قطرہ ہے اس بحرِ ناپیدا کنار کا جو کل روئے زمین پر محیط ہے۔ گویا تمہارا جسم ایک ذرہ ہے اُس مجموعۂ عناصر کا جس کی بے اندازہ مقدار دُنیا میں موجود ہے۔ پس اگر کوئی صاحبِ عقل و شعور کہیں نہیں ہے تو تمہارا عقل و شعور ہی ایک ایسی شے ہوئی جو تمہارے نصیب سے نہیں معلوم کہاں سے تم کو مل گئی۔ اور تم شاید یہ کہو گے کہ یہ تمام کائنات

اور یہ کل اجسام و اجرام کسی صاحبِ عقل و شعور کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ یونہیں مرتب و منظوم ہو گئے ہیں ؟

ا۔ میری سمجھ میں تو اور کوئی بات آتی نہیں۔ تو دُنیا میں جو چیز ہم بنتی ہوئی دیکھتے ہیں اس کا بنانے والا بھی نظر کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو دُنیا اور اس کے کُل کارخانے کو دیوتاؤں نے بنایا ہے اور وہی اس کا انتظام کرتے ہیں۔ مگر وہ دیوتا ہیں کہاں؟ کہیں نظر تو نہیں آتے۔

س۔ تم اپنی روح کو بھی تو نہیں دیکھتے جو تمہارے جسم کی حاکم ہے۔ لیکن نظر نہ آنے کے سبب سے کیا تم یہ نتیجہ نکالو گے کہ تم جو کام کرتے ہو وہ روح کی تحریک اور ہدایت کے بغیر خود بخود یونہی چلا جاتا ہے ؟

ا۔ (کچھ تذبذب کے ساتھ) مَیں خدا کی تحقیر تو نہیں کرتا۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کی ذات ایسی کامل اور غنی ہے کہ اس کو میری اور میری بندگی کی ضرورت نہیں ہے +

س۔ یہ سراسر غلطی ہے۔ با ایں کمال و استغنا جب دیوتا تمہارا اتنا خیال کرتے ہیں۔ تو تمہارا فرض ہے تم بھی اِن کی اتنی ہی حمد و ثنا کرو۔

ا۔ مجھے اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ دیوتا انسانوں کے کاروبار میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں تو مَیں ہرگز ان کی بھینٹ پوجا میں کوتاہی نہ کروں۔

س۔ ہیں! ابھی تم کو یہی یقین نہیں ہے کہ دیوی دیوتا انسانوں پر کیا کیا احسان کرتے ہیں! دیکھنے۔ سُننے۔ چکھنے کی قوّت تو جیسی اور جانوروں کو دی ہے ویسی ہی ہمیں دی ہے۔ مگر ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلنے کا شرف کیسا ہے؟ جانوروں کو تو یہ شرف نہیں ملا۔ اس سے انسان کو کتنے فائدے ہیں! اسی کی بدولت آگے دیکھتا ہے۔ دُور کی چیز تاک سکتا ہے۔ چوپائے اپنی ٹانگوں سے چلنے کے سوا اور کوئی کام نہیں لے سکتے۔ انسان پر اس معاملے میں بھی نفس علوی کا بڑا احسان ہے۔ اس کو ہاتھ بھی دیئے ہیں۔ کہ ان سے ہزاروں بڑے بڑے مفید کام لیتا ہے۔ اور فضیلت کے

علاوہ بیحد مسرت حاصل کرتا ہے۔ جانوروں کو زبان دی گئی ہے۔ مگر کلام کی طاقت ان میں نہیں ہے۔ کلمہ زبانِ انسانی ہی پر موضوع ہوتا ہے۔ جو اس کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ اُنہوں نے اور جانوروں کی لذّت و راحت کو خاص خاص وقتوں اور موسموں کے تابع رکھا ہے اور انسان کے لئے یہ سب قیدیں ہٹا دی گئی ہیں کہ ہر قسم کی راحت ہر وقت محسوس کرتا ہے اور ہر نوع کی لذّت ہر موسم میں روا ہے۔

خدا نہ صرف ہمارے جسم کی خبر لیتا ہے۔ بلکہ ہماری رُوح کی بھی خبر لیتا ہے۔ اس خالقِ کُل نے ہمیں نہ صرف جسمانی فضیلت دی ہے۔ بلکہ سب سے بڑی بخشش جس سے اس کی انسان پروری ظاہر ہوتی ہے وہ رُوحِ ناطق ہے جو اس نے ہمارے قالب میں پھُونکی ہے۔ اور رُوح بھی وہ جسے اشرف الارواح کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اور کس جانور کی روح خدا کو جان سکتی ہے اور اُس کی قدرت کے کارخانوں کو پہچان سکتی ہے؟ کیا انسان کے سوا کوئی اور ذی حیات بھی ہے۔ جو خدا کی بندگی کرتا اور اُسے پُوجتا ہے؟ کونسا جانور ہے جو آدمی کی طرح بھُوک۔ پیاس سردی گرمی سے اپنا بچاؤ کر سکتا ہے؟ اور کونسا جانور ہے جو آدمیوں کی طرح بیماری کی دوا کر سکتا ہے۔ اپنے قواء سے کام لے سکتا ہے۔ تحصیلِ علم کر سکتا ہے۔ اور اپنی دیکھی بھالی سُنی سُنائی باتوں کو تمام و کمال یاد رکھ سکتا ہے؟ اگر اس کی جسمانی اور رُوحانی فضیلتوں کا خیال کیا جائے تو انسان اور جانداروں کے مقابلے میں الوہیت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اگر اس کو بیل کا جسم دیا جاتا تو اس کی فہم کی رسائی کس کام آتی۔ منصوبے اور تدبیریں سوچ لیتا لیکن ان کی تعمیل بیل کیونکر کرتا؟ برعکس اس کے بیل کو انسان کا جسم ملتا اور عقلِ انسانی نہ دی جاتی تو دیگر بہائم سے کس بات میں افضل ہوتا؟ دیکھو تو سہی دیوتاؤں نے عمدہ سے عمدہ جسم تم کو دے کر کیسی لطیف ترین و شریف ترین رُوح اُس میں پھونکی ہے! کیا اب بھی تم

یہی کہے جاؤ گے کہ وہ تمہاری کچھ خبر نہیں لیتے؟ دیوتاؤں سے تم کیا چاہتے ہو۔ جو تمہیں یقین ہو کہ ہاں وہ تمہاری خبر گیری کرتے ہیں؟

ا ۔ مَیں چاہتا ہوں کہ جس طرح تمہارے بیان کے مطابق تمہارے پاس اُن کے پیغام آتے ہیں میرے پاس بھی آیا کریں اور مجھے بھی وہ براہ راست مطلع کرتے رہیں کہ مَیں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

س ۔ کیا جب وہ ایتھنز کے کُل باشندوں کے لئے کوئی ہدایت کرتے ہیں تو تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ تم سے مخاطب نہیں ہیں؟ جب غیر معمولی حادثات و کرامات کے ذریعے سے وہ کل اہلِ یُونان کو آنے والے واقعات سے متنبہ کرتے ہیں تو کیا وہ تمہاری طرف سے خاموش ہیں اور ایک اکیلے ارسطادموس ہی کو بھول جاتے ہیں؟ لوگوں کے دلوں میں جو اُنھوں نے یہ اعتقاد پیدا کر دیا ہے کہ رنج و راحت سب دیوتاؤں کی طرف سے ہے وہ رنج و راحت پر قادر ہونے کے بغیر ہی پیدا کر دیا ہے؟ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اگر یہ محض دھوکا ہوتا تو انسان آج تک اس سے بے خبر رہتے اور اس سے اپنے تئیں نہ بچاتے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ قدیم سے قدیم اور عاقل سے عاقل قومیں خُدا پرست ہوتی رہی ہیں۔ اور ہر ایک انسان کی عُمر میں خدا پرستی کی خواہش درجۂ کمال کو اس وقت پہنچتی ہے جب اس کی عقل پختگی کی سمت الراس پر ہوتی ہے؟ اے عزیز! دھیان کر کہ تیرا نفس کس طرح سے تیرے جسم پر اپنی مرضی کے موافق حکمراں ہے۔ اور یقین کر کہ اسی طرح ایک روح ہے جو کل عالم پر حاوی ہے اور اس کو اپنی مرضی کے موافق چلا رہی ہے۔ اس خیال کو دل سے نکال ڈال کہ تیری ناقص آنکھیں تو کوسوں دُور کی چیز کو دیکھیں اور خدا تعالٰی ایک ہی وقت میں سب چیزوں کو نہ دیکھ سکے۔ یہ خیال کر کہ میں ایتھنز اور مصر اور سسلی کے معاملات پر جامعیّت کے ساتھ غور و فکر کر سکتا ہوں اور خدائے عزّوجل کل کائنات کے معاملات پر ایک ہی وقت میں غور نہیں کر سکتا انسان کی احسان مندی کا امتحان جب ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی سلوک کیا

جائے۔ اِس کی دانائی کی آزمائش یوں ہوتی ہے کہ اس سے کسی مشکل اور پیچیدہ معاملے میں مشورہ طلب کیا جائے۔ اسی طرح اگر تم خدا کی قدرت اور مخلوق پروری کا ثبوت چاہتے ہو تو سچے دل سے اس کی بندگی اور پرستش کرو۔ اِس وقت تجھ کو یقین کامل ہوجائے گا۔ کہ خدا رب کو دیکھتا ہے۔ سب کچھ سُنتا ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ اور کل اور کائنات کا انتظام و انصرام کرتا ہے ✦　　(رجیا رام)

خوشی

دُنیاوی خوشی کیا ہے؟ کیا وہ خیالی صورت جس کا ذکر تو ہم نے ہزاروں مرتبہ سُنا مگر دیکھا کبھی نہیں؟ کیا وہ جس کے وعدے ہم سے ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ٹوٹتے ہیں اور پھر بھی ہم اِس کے وعدوں کا یقین کر لیتے ہیں؟ کیا وہ جو بلا کسی حقیقت کے صرف باتوں ہی باتوں میں بہلاتی ہے اور پھل کے بجائے صرف پھول ہی میں ٹال دیتی ہے؟ جو لوگ اِس کے مزے سے محروم ہیں وہ اس کے مشتاق ہیں مگر جو اُس کا لطف اٹھا سکتے ہیں وہ اِس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امید اس کی علم بردار ہے مگر مایوسی بھی اس کے ہم رکاب ہے۔ امید ہمارے تخیل پر مبنی ہے اور اس کے حصول کا ہمیں دلاتی ہے۔ مگر مایوسی ہمارے تجربہ کا نتیجہ ہے اور ہم مجبوراً اس کی بات کو صحیح مانتے ہیں۔ زندگی کے رقص کی تمام حرکات خوشی پر مبنی ہیں جو ہمیں پیچیدہ راستوں اور ٹیڑھی گھاٹیوں میں گذرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ مگر وہ ہم میں سے کسی دو افراد کو بھی ایک ہی راستہ سے نہیں لے جاتی۔ ارسطیس[1] اس کو نفسانی خطائظ میں ڈھونڈھتا ہے۔ سقراط[2] صرف

---

[1] ارسطیس (　　) حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے یونان میں پیدا ہُوا۔ اور سقراط کا شاگرد بنا۔ اس کا طریقۂ زندگی اپنے اُستاد کی رائے اور عمل کے برخلاف عیاشانہ اور زنانہ تھا۔ اور محض نفسانی خوشی کو نیکی سمجھتا تھا ✦

[2] سقراط ۴۶۹ قبل مسیح پیدا ہُوا ✦

حکمت میں سے اُسے پاتا ہے اور اپی کیورسؔ[۱] اِن دونوں کو اس کا سرچشمہ بتلاتا ہے۔
غرض اُس نے ہر ایک پر اپنا مقناطیسی اثر کیا لیکن کسی کو نگاہِ تلطف سے نہیں دیکھا۔
اگرچہ یہ لوگ بھی بہت سے اور طالبین کی طرح اُس کے خاص لُطف کی لاف زنی کرتے
رہے۔ اِس کی ناکامیابی دیکھ کر سٹوائکؔ[۲] فرقہ نے اُس کے حصول کا ایک نیا اور
عجیب طریقہ نکالا۔ یعنی اِس کا طالب رہنا مگر اُسے بُرا کہکر اُس کے حصول کی طرف
تکتا مگر اُس سے احتراز کرکے۔ غرض اُن کا تکبرانہ خیال یہ تھا کہ جتنا اُس سے بچا جائے۔

---

[۱] اپی کیورس یونانی فلسفی حضرت مسیح سے ۳۴۲ برس پہلے پیدا ہوا۔ فلسفہ کی تحصیل ایتھنس میں کی اور پھر ۳۰۶ قبل مسیح میں ایتھنس میں ایک باغ خرید کر وہاں سکونت اختیار کی اور اپنی تعلیم جاری کی۔ اسکی بڑی تعلیم یہ تھی۔ کہ اخلاق میں صرف خوشی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اور خوشی عقل کے مدد سے حاصل کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دانائی سب خوبیوں میں افضل ہے۔ اور صرف اخلاقی تکمیل سے خوشی میسر آتی ہے۔ رُوح کے غیر فانی ہونے سے اُس نے انکار کیا۔ دیوتاؤں کے وجود کو تسلیم کرتا تھا مگر کہتا تھا کہ انسانی معاملات سے وہ تعارض نہیں کرتے۔ اِس کی تصانیف سب معدوم ہوگئیں کچھ باقی ہیں سنہ ۲۷۰ قبل مسیح انتقال کیا۔

[۲] زینو۔ ایک یونانی فلسفی سٹوائک فرقہ کا بانی تھا۔ اسکی تاریخ پیدائش نامعلوم ہے مگر غالباً ۳۵۰ قبل مسیح پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک سوداگر تھا اور اُسنے اس کی پرورش بھی اپنے پیشہ کے مطابق کی ایک ناگہانی حادثہ سے جیسے سوداگروں کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں۔ وہ مُفلس ہو گیا۔ اور اُس نے فلسفہ کی تحصیل شروع کی مختلف مقامات میں مختلف فلسفیوں کے لکچر سُنے۔ مگر کسی سے اطمینان کلّی نصیب نہ ہُوا۔ آخر خود بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد حق کی تلاش کرتے کرتے اُسنے اپنی ایک جُدا تعلیم اختیار کی۔ زینو نہایت کمزور اور منحنی سا آدمی تھا اور اُس کے چہرے سے تفکر ظاہر ہوتا تھا۔ نہایت پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۹۸ برس کی عمر میں فوت ہُوا۔ اس کے ہموطن اس کی بے انتہا عزت کرتے تھے اس کی تعلیم عملی زندگی کے مطابق تھی یعنی آدمی کا بڑا مقصد صحیح عقل کے مطابق بسر کرنا ہے۔ نیکی یعنی کمالِ انسانیت صرف دانائی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صرف نیکی ہی خوشی کی بنیاد ہے۔ تمام نیک کام یکساں نیک ہیں۔ اور تمام بُرے کام یکساں بُرے ہیں۔ نفسانی جذبات کو مغلوب کرنا اور اُن سے آزاد رہنا کمالِ انسانیت ہے۔ اس کے شاگرد دل نے اسکی تعلیم کو بہت پھیلایا کیونکہ اُس کی تعلیم نہایت پسندیدہ اور نہایت ہر دلعزیز تھی۔ ۲۶۳ قبل مسیح وفات پائی ۱۲

اور جتنا اُس سے بھاگا جائے۔ اتنی ہی وہ ہماری طرف توجہ کرتی ہے اور ہمارے پیچھے دوڑتی ہے۔ اَے خوشی تو بھی ایسی ہی دھوکہ دینے والی ہے جیسے وہ سکون جو طوفان کے آنے سے پہلے عالم پر چھا جاتا ہے۔ تو بھی طوفان کی تبسم کن بیٹی یعنی قوس و قزح کے مانند خوش نما ہے۔ لیکن صحرا میں سراب کی طرح تو ہمیں اِس دھوکے میں رکھتی ہے جس کو فاصلہ زیادہ کرتا ہے اور قرب مٹا دیتا ہے۔ تاہم بغیر تلاش کئے اکثر تو میسر آجاتی ہے۔ اور جب تیری کوئی توقع نہ ہو تو تو آن موجود ہوتی ہے۔

جو لوگ نہایت سرگرمی سے خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اُن سے وہ کوسوں بھاگتی ہے۔ کیونکہ وہ اُسے وہاں ڈھونڈھتے ہیں جہاں وہ ہوتی نہیں۔

انتھنی[۱] نے اِس کو محبت میں ڈھونڈھا۔ بروٹس[۲] نے جاہ و جلال میں۔ اور سیزر[۳] نے حکومت میں۔ لیکن پہلا بے عزت ہُوا۔ دوسرا نفرت کیا گیا۔ تیسرا احسان فراموشی کا شکار ہُوا۔ اور تینوں کے تینوں مایوس ہو کر بُری طرح ہلاک ہوئے۔

بعض پر وہ عنایت کرتی ہے مگر جب اُنہیں نزے میں غرقاب پاتی ہے تو فوراً لُطف کی نگاہ کو بیرحمی سے بدل دیتی ہے کسی کو اپنی شیریں شراب کے جام پر جام دیتی ہے اور اِس کو اتنا مدہوش کرتی ہے کہ اِس کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو مخلوقِ خدا سے بالا تصور کرنے لگتا ہے۔ پھر اُس کو اس حال پر چھوڑ کر پستی کی طرف دھکا

---

[۱] انیتھنی مصر کی ملکہ کلیو پیٹرا کا سچا عاشق تھا مسیح سے چالیس یا پچاس برس پہلے ہوا ہے ۱۲

[۲] بروٹس ایک مشہور رومن ہے جو سیزر کے قتل میں شریک تھا۔ ابتدا میں اِس کو سیزر سے بڑی محبت تھی اور اُس کا دلدادہ دوست تھا۔ سیزر بھی اس پر پورا اعتماد کرتا تھا مگر اُس نے قومی جوش میں آکر سیزر کے خلاف سازش کی اور اسکو قتل کرایا۔ مگر پھر لوگ اسکے خلاف ہوگئے اور وہ ایک نہایت ذلت کی موت مرا۔

[۳] سیزر روم میں ۱۰۰ برس قبل مسیح پیدا ہُوا۔ نہایت فیاض اور سخی تھا۔ بہادری میں شہرۂ آفاق تھا۔ بہت سے فتوحات اپنے مخالف پومپی پر حاصل کرنے اور اس کو کئی جگہ شکست دینے کے بعد اُس نے روم میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنی شروع کی۔ اس کی عظمت اور شان و شکوہ ضرب المثل ہے۔ آخر بروٹس اور دیگر سازش کرنے والوں نے اس کو سینٹ کے دربار میں ۴۴ سنہ قبل مسیح مار ڈالا ۱۲

دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ تحت الثریٰ میں پہنچتا ہے۔ کبھی کسی پر اُس برق تبسم سے حملہ کرتی ہے۔ جس کا شکار نپولین[۱] ہوا۔ اور اپنے دیوانہ کو ایسی اداؤں سے لبھاتی ہے جو روشن چہرہ والا چاند بھی اپنے شیفتہ چکور کے واسطے اپنے ٹھنڈے نُور میں نہیں پیدا کر سکتا۔ مگر یہ سب کچھ لطف و شفقت اُس غصّہ و غضب کا پیش خیمہ ہے جس کا ظہور اس کی عادت میں داخل ہے۔ اور یہ کرم کی نگاہیں آثار ہیں اُن فراق کے تیروں کے جن کا مزہ وہ چکھانے والی ہوتی ہے۔ تاہم زمانہ اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور اس کو ملکہ جانتا ہے۔ جذبات اِس کے غلام ہیں اور اِس کے دربار میں دست بستہ اُس کے حکم کے منتظر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اُس کے گرد بھی بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح امرا۔ وزرا۔ اور ارکین سلطنت کی ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور اس لئے اس کی حضوری میں رسائی اور اُس سے ہمکلامی نہایت ہی مشکل ہے۔ جاہ طلبی۔ حرص۔ محبت۔ انتقام سب کے سب اُس کے اور صرف اُس کے متلاشی کھڑے رہتے ہیں۔ مگر افسوس نہ اُن کی رسائی اُس تک ہو سکتی ہے اور نہ وہ خود اُن تک آ سکتی ہے۔ لیکن وہ اُن کے پاس اپنے ادنیٰ اور ذلیل ایلچی بھیجتی رہتی ہے۔ جاہ طلبی کے پاس طاقت کو۔ حرص کے پاس دولت کو۔ محبت کے پاس رقابت کو۔ انتقام کے پاس پشیمانی کو۔ مگر افسوس یہ سب کیا ہیں؟ محض مایُوسی کی دوسری صورتیں ہیں! نہ خوشامد سے نہ رشوت سے اُس کو پھسلایا جا سکتا ہے۔ مگر ہاں اُس کے حصُول کا بہترین ذریعہ اُس کے دشمنوں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنا ہے۔ کیونکہ خود اس کو براہِ راست خوشنود کرنا ممکن الوقوع نہیں۔ وہ لوگ جو اُس کے دشمنوں پر فتحیاب ہوتے ہیں۔ انہیں اُس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ خود ان کے پاس دوڑی آتی ہے ؎

اگر وہ کسی اور طرح حاصل ہو سکتی تو سب سے پہلے بادشاہوں کا حصّہ ہوتی۔ کیونکہ اُن سے زیادہ اُس کے طالب اور لوگ نہیں ہوتے۔ اور وہ اتنی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ کہ زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر اُسے حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ بادشاہوں کا بھی اتنا ہی لحاظ

---

[۱] نپولین فرانس کا مشہور بادشاہ اور یورپ کا فاتح جزیرہ کورسیکا میں ماہ سنہ ۱۷۶۹ء میں پیدا ہُوا ۱۲

کرتی ہے جتنا اِن کی رعایا کا۔ اور اُن کے محلّوں میں صرف اپنے نقیب مثلِ شان و شوکت جاہ و جلال۔ ساز و سامان وغیرہ کو بھیج کر اپنی آمد کا اُنہیں منتظر رکھتی ہے مگر جاتی کبھی نہیں۔ آخر کیوں؟ کونسی چیز اُسے روکتی ہے؟

اوہ۔ اوہ وہ تو قناعت کی شیا ہے۔ اور بھیس بدل کر اس کی مُلاقات کو ہمیشہ جایا کرتی ہے۔ کہ تنہائی میں اُس کی صحبت کا لُطف اُٹھائے اور جنگل کی جھونپڑی کے اندر اُس کی نباتات کی دعوت میں اُس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو۔

تو ہاں اے ملکہ۔ میری سچی اور سنجیدہ باتیں سُن بادشاہ ایسی باتیں کم سُنا کرتے ہیں۔ لیکن تو سُن۔ مَیں نہ تجھ سے قطعی نفرت کرتا ہوں اور نہ تیرا دیوانہ ہوں۔ تیرا لطف عارضی ہوتا ہے۔ اور تیری بخشش تیری سلطنت کے اندر ہی اندر محدود ہوتی ہیں۔ تو بھی اور بادشاہوں کی طرح دوسروں کا سہارا تکتی ہے اور ان کی طرح اگر تو بھی اپنے سہارے سے محروم کر دی جائے تو تو اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتی۔ اگر قناعت تیرا ایک ہاتھ پکڑ کر اور تندرستی دوسرا ہاتھ پکڑ کر تجھے سہارا نہ دیں۔ تو تو ایک نکمّے اور فضول جسم کی طرح زمین پر گر پڑے +

(ترجمہ) لطیف احمد پانی پتی

موسیقی

سوائے حُسن کے جہان بھر میں غالباً کسی شئے کو وہ قبولیت عام حاصل نہ ہوگی جو موسیقی کو حاصل ہے۔ جدھر نظر ڈالئے جہاں دیکھئے۔ قلب انسانی اس پر فریفتہ و شیفتہ نظر آتا ہے۔ پتھروں کے پگھل جانے پہاڑوں کے ٹل جانے اور خود بخود آگ لگ جانے کے قصّے غلط سہی مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ موسیقی کا جادو نہ صرف انسان پر بلکہ تمام جانداروں پر چلتا ہے۔

موسیقی کی بناوٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اجزاء آواز کی ایک خاص

قسم کی چال (جس کو "لے" کہتے ہیں) حصہ ہائے آواز کی ایک خاص ترتیب (جسے "تال" کہتے ہیں) اور خود آواز (جس کو "سُر" کہتے ہیں) ہیں۔ پہلے دو اجزا عقلِ انسانی کی صنعت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں اور اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ حُسن بزورِ ہنر صرف اور چیزوں میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آواز میں بھی اس کا ظہور ممکن ہے۔ یہ وہ حُسن ہے جس کا احساس جاہل سے جاہل شخص اور بیدل سے بیدل انسان کو ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صاحبِ فہم اس احساس سے زیادہ لُطف اُٹھاتا ہے اور یہ مقابلۃً کم۔ "سُر" موسیقی میں وہ چیز ہے جو دراصل موسیقی کی جان ہے۔ اور جس کے بغیر موسیقی موسیقی نہیں۔ غور سے دیکھئے تو یہ "سُر" تاثرِ قلبی کا ہو بہو عکس ہے۔ کسی موسیقیانہ آواز کو آنکھیں بند کر کے دھیان لگا کر سُنیئے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنے دل کا حال مو بمو آپ سے کہہ رہا ہے۔ کبھی کسی رنج کو یاد کر کے آہ کھینچتا ہے جس کو سُن کر آپ بھی بیتاب ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی لُطف کو یاد کر کے قہقہے لگاتا اور خوش ہوتا ہے جس کے اثر سے آپ کا سارا غم و الم دم بھر میں کافور ہو جاتا ہے۔ موسیقی کے ایجاد کرنے والوں کی قدرت اور وسعتِ خیال پر نظر کر کے حیرت ہوتی ہے کہ تاثر سی لطیف چیز کو تقسیم کر کے کس کس انداز سے ترتیب دیا ہے۔ اور کس طرح ایک قطرے کو دریا بنا دیا ہے ؎

موسیقی کا اثر دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ جو تال اور لے سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ اثر عام و خاص دونو پر پڑتا ہے۔ دوسرا وہ جو مختلف سُروں کی کیفیات کی وجہ سے طاری ہوتا ہے۔ اس کے لئے ذرا صاحبِ دل ہونا ضروری ہے۔ ناٹک کے گانے۔ مجلسِ عزا کے سوز۔ عشق و محبت کے گیت سب اپنی تاثیر کے لئے سُروں کے محتاج ہیں اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ موسیقی جب ان جذبات کے ساتھ مل جاتا ہے تو جذبات کی تصویر اُترتا تو ایک طرف نقل کی کیفیت اصل سے بڑھ جاتی ہے ؎

یوں تو موسیقی کس ملک اور کس قوم میں نہیں۔ مگر جو بات ہندوستانی موسیقی میں ہے۔ غالباً کسی میں نہیں۔ اس کا کمال اس کے باریک باریک امتیاز اس کی سچی اور اثر میں ڈوبی ہوئی کیفیات اس کی تال کی پُرلطف پیچیدگی اس کے لے کا لوچ اور تڑپ یہ سب وہ

چیزیں ہیں جن کا نشان یورپ کے ترقی یافتہ موسیقی میں کہیں نہیں ملتا۔ بلاشبہ یورپ کا موسیقی ابھی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے اور اس لائق ہے کہ سالہا سال ہندوستانی موسیقی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے ٭

ایک غلط سال عام طور سے موسیقی کی قدیم مقررہ طرزوں کی نسبت پھیلا ہوا ہے وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک طرز کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس خیال کا باعث وہ طرزیں ہیں جو صبح کی چیزیں کہلاتی ہیں۔ ان طرزوں میں مایوسی درد اور تفکر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور صبح کے وقت ان کو گانے سے ان سب کا اثر اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اوقات پسند گروہ اسی پر قیاس کر کے کہدیتا ہے کہ یہ چیزیں صبح سے مخصوص ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ موسیقی کو اوقات سے کوئی ایسا تعلق نہیں۔ اگر ہے تو اتنا کہ بعض بیحد افسردہ طرزیں سوائے سکون اور سکوت کے عالم کے کسی دوسرے وقت نہیں کھلتیں اور سکون و سکوت کی موجودگی ہر طرز کے لئے باعثِ فروغ ہے۔ چاہے سکون و سکوت صبح کو ہو دوپہر کو ہو یا آدھی اور پچھلی رات کو۔ یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ آدھی رات پچھلی رات اور تڑکے کی چیزیں کسی اور وقت ہیں وہ لطف نہیں دیتیں جو مذکورہ اوقات پر دیجاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ چپ چاپ وقت ان دردبھری چیزوں کے لئے زیادہ موزون ہیں۔ مگر یہ امر ہرگز ماننے کے قابل نہیں کہ دن کی چیزیں بھی اسی طرح رات کو کبھی نہیں کھلتیں۔ ہندوستانی کھیٹر کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کرتے اور جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ وہ بالکل حق بجانب ہیں ٭

کہتے ہیں کہ یورپ کے موسیقی میں شادی اور غم کے لئے الگ الگ طرزیں مخصوص ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں بھی اس قسم کا امتیاز ممکن ہے مگر بہت مشکل۔ ہندوستانی موسیقی وہ بیش قیمت زربفت ہے۔ جس میں شادی و غم کے گنگا جمنی تار کچھ اس طرح پیوست ہوتے چلے گئے ہیں کہ ایک تار کو دوسرے تار سے الگ کر دکھانا اور اعجاز سے کم نہیں۔ بس ممکن ہے تو صرف اس قدر کہ بعض چیزیں زیادہ افسردہ نظر آتی ہیں اور بعض چیزیں زیادہ شگفتہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس افسردگی اور شگفتگی میں تال کا بہت بڑا

دخل ہے۔ یہ تال وہ چیز ہے کہ خالص افسردہ سُروں سے اگر اس کو چسپاں کردیں تو اُن کی افسردگی تک نسیاً منسیاً ہو جاتی ہے +

ہندوستانی موسیقی کے کمال کا باعث وہ عظیم الشان تاثر ہے جس کا وجود ہندوستان کے مشہور فلسفے میں پایا جاتا ہے۔ اس موسیقی کی بعض بعض طرزیں ایسی ہیں کہ انسان کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا دیں یا دریائے تحیر و تفکر میں اس قدر غرق کردیں کہ دُنیا و مافیہا کی خبر نہ رہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے بعض اکابرِ ملت نے اشغالِ موسیقی کو ممنوع ٹھہرایا ہے۔ اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ ہر شخص کو اس آتشِ سیال کا استعمال راس نہیں آتا۔ اُمراء جن کو سب کچھ حاصل ہے اور صلحا جو درد کے بڑھنے کو درد کا علاج جانتے ہیں۔ ان اشغال میں انہماک رکھیں تو مضائقہ نہیں۔ عوام الخاص کو اور اُن عوام النّاس کو جو ہزاروں دبی آرزوئیں دلوں میں لئے ہوئے ہیں موسیقی کی ہَوا سے بچنا چاہیئے ورنہ موسیقی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا ئیگا۔ اور اس کا انجام عشق یا دیوانگی ہوگی + (سید نذیر حسین)

فریبِ دولت

سیٔسل اور اس کی بیوی **ہلڈا** کھانے کے کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور **سیٔسل** ساتھ کے ساتھ ڈاک بھی دیکھتا جاتا ہے +

سیٔسل۔ جدھر دیکھو بِل ہی بِل۔ کہیں قصاب کا بِل ہے کہیں کوئی دوکاندار روپے کے لئے جھینک رہا ہے۔ کیا کیا جائے عجب حالت ہے +

ہلڈا۔ ہاں سچ ہے بِل کسی طرح بھی نہیں رُکیں گے۔ یہ تو آتے ہی رہیں گے۔ اچھا تم یہ انڈا تو دکھاؤ +

سیٔسل۔ بیشک ایسے نازک وقت میں انسان کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ بلکہ ایسی تکلیفوں کے برداشت کرنے کے لئے آدمی کو اپنی جسمانی طاقت کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے +

ہلڈا۔ بجا ہے۔ صحت کا خیال مقدم ہے +

سیسل۔ ہلڈا! کبھی تم نے اس روپے کا بھی اندازہ کیا ہے جو ان بلوں کو ڈاک میں بھیجنے پر صرف ہوتا ہے اور بل بھی وہ جن کی ادائیگی کبھی نہ ہوگی۔ اس طرح ہم گورنمنٹ کو بہت فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ٹکٹ زیادہ بکتے ہیں نا؟

ہلڈا۔ وہ۔ تم ان بلوں سے نہ گھبرایا کرو۔ ہم تو اب ان سے ایسے مانوس ہو گئے ہیں کہ کبھی خیال بھی نہیں آتا +

سیسل۔ مگر میری طبیعت تو ان سے بہت اُکتاتی چلی ہے۔ توبہ توبہ ہروقت ایک ہی بھیانک شکل نظر آتی ہے۔ اگر یہ سوداگر لوگ اپنے بلوں کو مستطیل لفافوں کی بجائے مربع لفافوں میں بھیجا کریں تو اچھا ہو +

ہلڈا۔ میرے خیال میں تو ابھی تین چار مہینے تک ہمیں کہیں سے بھی روپیہ نہیں مل سکتا +

سیسل۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ اس سہ ماہی کے گذرنے پر ہماری سالانہ آمدنی میں سے صرف ایک ہزار روپیہ وصول ہوگا۔ مگر کیا ہے۔ ہمارا قرض اس سے کہیں زیادہ ہے

ہلڈا۔ سیسل! اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تم آمدنی کی کوئی اور صورت بھی نکالو +

سیسل۔ میں کب نہیں چاہتا۔ سوال تو یہ ہے کہ کس طرح۔ مزدوری میں کر نہیں سکتا۔ اپنے عزیز رشتہ داروں کے پاس میں جا کر دیکھ لیا۔ اب کریں تو کیا کریں +

ہلڈا۔ اپنی بدنصیبی کو روتی ہوں۔

سیسل۔ عقل حیران ہے۔ کوئی شخص مجھے یہ تو الزام دے نہیں سکتا کہ میں کچھ کرتا نہیں اور سست ہوں۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں برابر چار گھنٹے کی اوسط سے کام کیا کرتا ہوں۔ اس عرصے میں ایک دیوان ترتیب دیا ہے ایک ڈراما اور سال بھر کی محنت اور جانفشانی سے ایک ناول ختم کر چکا ہوں۔

ہلڈا۔ بیشک یہ کتابیں تو تم نے اچھی لکھی ہیں مگر ان سے وصول کچھ بھی نہ ہوا

سیسل۔ وصول؟ خسارہ ہی رہا۔ دیوان تو میں نے اپنے صرف سے ہی چھپوایا تھا۔ جس کی اس وقت تک کل گیارہ جلدیں فروخت ہوئی ہیں اور قریب چھ سو روپئے کے مجھے مطبع والوں کا دینا ہے۔ میری ان دونو کتابوں کو تو بڑی ہی سیر کرنی پڑی۔ اب تک کئی مطبع جھانک چکی

ہیں۔کوئی کمبخت ان کو لینے ہی کا روادار نہیں۔چار مرتبہ تو میں خود صاف کرکے بھیج چکا ہوں اور صاف کرنے کے بل کا بھی روپیہ ابھی تک ادا نہیں ہُوا ؎

ہلڈا۔ اِس سے تو ہمیں اور بھی خسارہ ہُوا میرے خیال میں اس محنت و مشقت سے تو بیکاری مفید ہے اور اسی میں بھلائی معلوم ہوتی ہے

سیسل۔ واقعی محنت بیکاری سے ہمیں گراں پڑتی ہے۔ اصل میں ہمیں کام کرنے ہی کی توفیق نہیں ؎

ہلڈا۔ یہ تو کچھ امیروں ہی کا حصہ ہے۔کہ وہ کام کریں۔بھلا ہماری کیا اوقات ہے۔بیکار رہیں گے قرض تو نہ بڑھیگا۔غریب لوگوں کو تو یہی لازم ہے کہ امیروں کی طرف دیکھتے رہیں کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔اور خود گوشۂ تنہائی میں عافیت سے بیٹھے رہیں۔سچ تو یہ ہے۔ اور کیا کریں محنت کرتے ہیں تو اور زیر بار ہوتی ہے ؎

سیسل۔ مگر جہاں تک ہو سکے ہمیں کفایت شعاری کرنی چاہئے۔اچھا ہُوا جو میں نے وہی انڈا بھی کھا لیا کیونکہ ہماری حالت اس وقت بہت نازک ہے۔ہمیں چاہئے کہ ہم بڑی جوانمردی سے اِس مصیبت کا مقابلہ کریں۔اور جوانمرد بننے کے لئے تم جانتی ہو اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔اچھا ایک کاغذ کا ٹکڑا لاؤ اور بتاؤ کہ کون کون سی چیزیں جن کے بغیر ہم گذارہ کر سکتے ہیں ؎

ہلڈا۔ واہ ایسی چیز کونسی ہے جس کے بغیر ہم رہ سکیں۔

سیسل۔ کیا واقعی کوئی ایسی چیز نہیں۔

ہلڈا۔ کھانا ہم کھائیں گے ہی۔

سیسل۔ بیشک کھانا ضروری ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اسے اور بھی مختصر کردیں مثلاً اتوار کی حاضری موقوف۔پیر کو سہ پہر کا نُقل اُڑا دیں۔منگل کو چاہئے نہ ہو اور بدھ کا سرے سے کھانا ہی۔القط۔

ہلڈا۔ نہیں یہ نہ ہو سکے گا۔اگر تم سہ پہر ہی کو کچھ نہ کھاؤ تو چائے اسی کثرت سے پی جاؤ گے تو کسر نکل جائے گی۔اور پھر چائے کے ساتھ کیک، جو تمہارا من بھاتا کھاجا ہے اور کس قدر

گراں ہے کتنا اُڑا جایا کرو گے۔ نہیں صاحب یہ نہیں سمجھ میں آئی۔ اچھا اگر ہم دن کو نہ کھائیں تو رات کو تو کھانا پڑے ہی گا اور اس طرح بیچاری خادمہ کو بہت تکلیف ہوگی +

سیسل۔ خیر تو کھانے میں کوئی تخفیف ممکن نہیں۔ اب آؤ ذرا تم لباس کی طرف +

ہلڈا۔ سیسل برا نہ ماننا اگر کل ہی تم مجھے بھدّے لباس میں دیکھو تو کیا تم نفرت نہ کرو گے۔ علاوہ ازیں میری وزن کا بل تمہارے ورزی کے بل سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس غریب پر ظلم کیا جائے +

دوسرے تم جانتے ہو کہ آدمی کی عزت لباس سے ہی ہوتی ہے (النّاسُ باللّباسِ) واقعی اگر تم پھٹے پرانے کپڑے پہنا کرو۔ تو میرے خیال میں کوئی تمہاری طرف توجہ بھی نہیں کرے۔ ہم تو پہلے ہی کسی شمار و قطار میں نہیں مگر اس طرح اور بھی ذلیل ہو جائیں گے۔

سیسل۔ تو معلوم ہوا اس میں بھی اور کفایت کی گنجائش نہیں۔ اچھا اب کرائے کی گاڑیوں کو لیجئے +

ہلڈا۔ ہاں گاڑیوں کا کرایہ یہاں بہت زیادہ ہے مگر تم اچھے کپڑے پہن کر ٹرام میں بھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک آنے کی خاطر بیس پچیس کے سوٹ کا ستیاناس کر دیا جائے یہ کونسی عقلمندی ہے۔ ہم باز آئے ایسی کفایت شعاریوں سے +

سیسل۔ اچھا کوئی چیز اور لکھنے کے قابل ہے +

مفصلۂ ذیل امور میں کفائیت شعاری ضروری ہے +

(۱) کوئی کام نہ کیا جائے کیونکہ اس سے قرض کے بڑھنے کا اندیشہ ہے +

اور..... اگر ہمیں قرضخواہوں نے زیادہ دق کیا تو ہم یہاں رہنے ہی کے نہیں۔

ہلڈا۔ یہ اچھا ہوگا میں خود ویسٹ لنٹنگٹن کو پسند نہیں کرتی۔

سیسل۔ یہاں ہم جیسے آدمیوں کا گذارہ بھی نہیں +

ہلڈا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا ناول کبھی کا بک گیا ہوتا۔ اگر ہم کہیں (پارک) کے قریب ہوتے +

سلے یہاں عموماً غربا اور کم حیثیت لوگ رہتے ہیں ۱۲

سیسل۔ میرا بھی یہی خیال ہے آجکل ہر چیز کا انحصار پتہ پر ہے اب دیکھئے نہ معمولی آلو اگر یہاں سے خرید کرو تو ایک آنہ سیر ملیں گے! اگر یہی آلو دوسرے بازار میں جاکر بکنے لگیں تو ایک روپیہ سیر ہو جائیں۔

ہلڈا۔ پیارے سیسل ایک چیز بڑی غنیمت ہے جو ہمیں یسّر ہے اور وہ یہ کہ ہم کو آپسمیں بیحد محبّت ہے +

سیسل۔ واقعی اگر یہ بات بھی نہ ہوتی تو بہت مشکل ہوتی۔ یہ دن کٹنے مشکل ہو جاتے۔

(ایک دوسرے کو پیار کرنے لگتے ہیں)

ہلڈا۔ سیسل پیارے! کیا تم نے سب ڈاک دیکھ لی ؟

سیسل۔ سب کہاں۔ ابھی بہت سے خط بند پڑے ہیں سب کا ایک مضمون ہوگا۔ کہاں تک پڑھے جائیں +

ہلڈا۔ اچھا مجھے دکھاؤ (ایک خط دیکھکر) اوہو تم نے یہ لمبا لمکا را خط کھولا ہی نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہت ضروری ہے +

سیسل۔ (خط ہاتھ میں لیکر) یہ ؟ نہیں یہ ضروری نہیں یہ تو کسی کمپنی کا اشتہار ہے کہ حصّے خریدو۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب انسان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا لوگ ایسی ایسی تجویزیں کرتے ہیں کہ جن میں ۲۵ فیصدی منافع تو یقینی ہو +

ہلڈا۔ اچھا اِس خط کو تو کھولو۔

سیسل۔ اجی رہنے بھی دو۔ میں اِن کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہوں۔

ہلڈا۔ اچھا میں کھولتی ہوں (ایک خط کھول کر پڑھنے لگتی ہی ہیں) کیا! یہ کس طرح سچ ہو سکتا ہے +

سیسل۔ کیا ہے پیاری ؟ مجھے دکھانا۔

ہلڈا۔ اِس کو پڑھو۔ سیسل!

سیسل۔ خط پڑھتا ہے:۔

جناب مکرّم بندہ۔

آپ کے مرحوم چچا کی وصیت کے بموجب ہم آپکو اطلاع دیتے ہیں کہ آپ ہی ان کے جائز وارث ہیں۔ ترکہ جو آپ کو وراثت میں آیا ہے اُس کا تخمینہ ۳۰ لاکھ روپئے کے قریب ہے۔ اس رقم کے متعلق آپ کی ہدایات کے ہم منتظر ہیں امید ہے کہ آپ بہت جلد مناسب ہدایات بھیجکر ہمیں ممنون فرمائیں گے +

گرین فیلڈ کمپنی

ہلڈا۔ چچا کے وارث اور پھر اکیلے تم ہی ؟

سیسل۔ اور اکٹھا تیس لاکھ روپیہ ؟

ہلڈا۔ اور آپ کی ہدایات کے منتظر ؟

سیسل۔ اوہ ! میری حیثیت سے یہ اس قدر زیادہ ہے کہ مجھے باور نہیں آتا۔ شکر ہے کہ میں نے وہ انڈا ابھی کھا لیا تھا ورنہ اس دُنیا میں مقابلہ بڑا ہی مشکل ہے۔

ہلڈا۔ سیسل ! کیا اس سے یہ مراد ہے کہ ہم تیس لاکھ روپئے کے مالک ہیں۔

سیسل۔ اگر گرین فیلڈ کمپنی کا کوئی وجود اور وہ دروغگو بھی نہیں تو ہم یقیناً مالک ہیں۔

ہلڈا۔ کیا وہ جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں ؟

سیسل۔ مگر اُن کا نام بہت مشہور ہے اور ان کی ساکھ بہت قائم ہے۔

ہلڈا۔ کیا واقعی اس قدر روپیہ اب ہمارا ہے۔

سیسل۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہے۔

ہلڈا۔ تعجب ہے ابھی کھانے کے وقت تو ہم مفلس و نادار تھے اور اب ہم اِس قدر متمول بن گئے

سیسل۔ گویا ہم نے بہت ترقی کی ہے۔ جھونپڑی سے محل میں جا براجے۔

ہلڈا۔ مگر اس خط میں لکھا ہے کہ تمہارا مرحوم "چچا" سیسل تمہارے ایک چچا بھی تو تھے۔

سیسل۔ چچا۔ تایا کا رشتہ ایسا ہے کہ اُن سے کوئی شخص خالی نہیں۔ ہر شخص کے کئی چچا ہوتے ہیں لیکن میرے تو سگے چچا بھی ہیں۔

ہلڈا۔ تمہارے خیال میں یہ پھر کس کا انتقال ہُوا۔

سیسل۔ میں سمجھتا ہوں شاید آسٹریلیا والے چچا مر گئے۔

ہلڈا۔ مجھے تو یہ معلوم نہیں تھا کہ تمہارے کوئی چچا آسٹریلیا میں بھی ہیں۔
سیسل۔ ایک ہی آسٹریلیا میں تو ہر شخص کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہوتا ہے۔ میرے چچا کی طبیعت میں آوارگی سی تھی وہ اپنے کنبہ کو چھوڑ کر وہیں چلا گیا۔ اور اُس کے بعد آجتک ہم نے کبھی کوئی خبر نہیں سُنی۔ اتنا ہم جانتے ہیں کہ وہ آسٹریلیا گیا تھا۔ اور وہاں اس نے روپیہ بہت کمایا۔
ہلڈا۔ اس قدر روپیہ کس طرح کمایا؟
سیسل۔ اس کا بھیڑوں کا بیوپار تھا اور اسی تجارت کی وجہ سے دیکھ لو کہ وہ کس قدر مال چھوڑ مرا ہے۔
ہلڈا۔ مگر اس روپے کے وارث تم کس طرح ہو گئے
سیسل۔ میرا چچا بوڑھا تو ہو ہی گیا تھا۔ مگر حُب وطن کا مادہ اس میں جوان تھا وہ اس لئے خود تو نہ آسکا روپیہ اُس نے عزیز بھتیجے کو بھیج دیا۔
ہلڈا۔ کیا وہ تم کو بہت عزیز سمجھتا تھا۔
سیسل۔ یہ تو اب ظاہر ہی ہے۔
ہلڈا۔ مگر تم کبھی اس سے ملے نہیں
سیسل۔ یہ سچ ہے مگر اُس نے میرا دیوان ضرور دیکھا ہوگا۔ اُس نے ضرور ان گیارہ جلدوں میں سے ایک جلد خریدی ہوگی۔ دیکھو ہلڈا وہ چھ روپے کی رقم جو ابھی تک مجھ کو مطبع کی دینی ہے۔ آخر کار میرے لئے کس قدر روپیہ لے آئی۔ خیال کیجئے۔ تین ۳ لاکھ۔ دس نہ بیس ۲ پورے تیس ۳۰ ۔
ہلڈا۔ مگر سیسل یہ سب باتیں اپنے چچا کے متعلق تمہیں کیونکر معلوم ہوئیں۔
سیسل۔ میری جان۔ آجکل کے افسانوں کو دیکھ کر آدمی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ اس قسم کے واقعات اسی طرح واقع ہوتے ہیں۔
ہلڈا۔ خیر جانے دو ان باتوں کو۔ ہمیں تو اب یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم تین ۳ لاکھ روپے کے مالک ہیں۔
سیسل۔ اچھا مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا دو (حساب کرکے) دیکھو ایک روپیہ ڈیڑھ انچ

لمبا ہوتا ہے۔ اس حساب سے اگر تیس لاکھ روپیہ ایک ہی قطار میں رکھا جائے تو قریباً پانچ میل تک پہنچ جائے گا۔

ہلڈا۔ سیسل تم کس قدر بیوقوف ہو تم اس روپے کو اس طرح رکھنا چاہتے ہو۔ نہیں میں تو خرچ کروں گی۔ بھلا یہ تو بتاؤ میں کتنا خرچ کر سکوں گی۔

سیسل۔ ہمیں وقت بیوقت کا بھی فکر چاہیئے۔ اور اگر روپے ایسی محفوظ جگہ لگائیں جہاں کسی قسم کا خطرہ نہ ہو تو ہمیں دس ہزار ماہوار کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

ہلڈا۔ دس ہزار ماہوار۔

سیسل۔ تو اور کیا۔ واقعی نہائیت معقول آمدنی ہے۔

ہلڈا۔ اب ہمیں ہر چیز میسر آسکتی ہے۔ اچھا کچھ روپیہ تو دو مجھے ابھی درکار ہے۔

سیسل۔ واہ! ابھی ذرا دم تو لو۔ اس قدر بے صبر نہ بنتی جاؤ۔ تم تو جانتی ہی ہو بھلا اس وقت میرے پاس کیا دھرا ہے۔

ہلڈا۔ اچھا تم ٹوپی سر پر رکھو اور ابھی جا کے روپیہ لے آؤ۔

سیسل دیکھو جی ہمیں اس قدر جلدی نہیں چاہیئے۔ کسی طرح گرین فیلڈ والوں کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم بالکل ہی مفلس و قلاش ہیں۔ اور ہم روپے کے اس قدر بھوکے ہیں۔

ہلڈا۔ مگر میں واقعی بھوکی ہوں۔

سیسل۔ یہ میں جانتا ہوں مگر تاہم ہمیں اپنی ضرورت اور خواہش کو چھپانا چاہیئے خودداری کو ہاتھ سے نہ دو۔ سہ پہر کے کھانے کے بعد میں اطمینان سے وہاں جاؤں گا۔

ہلڈا۔ نہیں صاحب میں تو اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتی۔ آج ایک دوکان پر میں نے پیرس کا نہایت خوبصورت ڈریس بالکل نئے نمونے کا دیکھا ہے اُسے میں فوراً خریدنا چاہتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اور عورت خرید لے۔

سیسل کیا تم اُسے اُدھار نہیں لا سکتی۔

ہلڈا۔ میں کیوں اُدھار لاؤں میں مانگ بھی نہیں سکتی۔

[illegible] جہیز کو خرید لینا ؎

ہلڈا۔ مَیں کہتی ہوں کل صبح تک اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ رہے گا +

سیسل۔ تو مَیں اور لے دوں گا +

ہلڈا۔ دیکھو سیسل! مجھے رنجیدہ نہ کرو یہ پوشاک مجھے بہت پسند ہے اب جو خدا نے ہمیں اس قدر روپیہ دیا ہے تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ جب ہم مفلس تھے مَیں نے کبھی بھی ایسی کوئی چیز تم سے طلب کی تھی۔ اب خدا کے فضل سے ہم بہت متموّل ہیں اور اپنی حیثیت کے قائم رکھنے کے لئے یہ لباس میرے لئے ضروری ہے۔ بس اب میری یہی ضد ہے اور یہ تمہیں اٹھانی پڑے گی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ذرا میرے حال پر عنایت فرمایئے اور سیدھے گرین فیلڈ کمپنی کی طرف تشریف لیجائے اور وہاں سے فوراً روپیہ لیکر مجھے اسی دوکان میں ملئے جہاں مَیں نے وہ لباس دیکھا تھا۔ دیکھو بارہ بجے ضرور پہنچ جانا۔

سیسل۔ میری پیاری ہلڈا۔ تم شاید اس رنج کا اندازہ نہیں کر سکتیں جو مجھے تمہاری درخواست کے رد کرنے میں ہوتا ہے۔ لیکن مَیں کیا کروں مجبور ہوں میری خودداری اس طرح قائم نہیں رہ سکتی اگر میں اپنے مختاروں کے پاس سہ پہر سے پیشتر جاؤں۔ سنو۔ سنو۔ بلکہ مَیں تمہارے ایک عارضی اور فضول شوق کی خاطر اپنی عزت کو بالائے طاق نہیں رکھ سکتا۔ تم ہی بتاؤ اس میں کس قدر سبکی ہے۔ ابھی تو ہمارے پاس اطلاع پہنچی ہے اور ابھی پانچ ہی منٹ کے بعد ہم روپیہ کے تقاضے کے لئے وہاں جا پہنچیں۔ تو یہ تو بہ اس سے کس قدر سفلہ پن۔ بے صبری حرص اور احتیاج ٹپکتی ہے +

ہلڈا۔ کیا کہا؟ آپ کی عزت جاتی ہے؟ چہ خوش۔ اب آپ عزت والے بھی بن گئے۔ سُبحان اللہ +

سیسل۔ تیس لاکھ روپے کی رقم ایک عزت بھی ساتھ لاتی ہے +

ہلڈا۔ مگر اس سے پہلے تو تم ہمیشہ میری بات مان لیا کرتے تھے +

سیسل۔ بجا ہے لیکن اس وقت مَیں اس کے سوائے اور تمہیں کسی طرح خوش نہیں کر سکتا تھا اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ تم کس خیال میں ہو؟ تیس لاکھ روپیہ بھی کچھ چیز ہے یا نہیں۔ ایک لاکھ روپے سے تو سر پھر جاتے ہیں اور یہاں تو پھر تیس لاکھ ہیں۔ تمہاری خوشنودی مزاج مجھے

ہمیشہ قائم ہوگی مگر گھر بار کے مالک مختار اب مجھے سمجھو۔ تمہیں میری ماننی پڑیگی ⁂

ہلڈا۔ کیا بکواس کر رہے ہو۔ گھر بار کے مالک بھی بن گئے۔ ابھی چھچھوڑے پہ اترائے ہو ⁂

سیسل۔ نہیں اب ہم یہاں نہیں بیٹھینگے۔ مگر میں نے تم کو جتا دیا ہے کہ جس طرح میری رائے ہوگی اُسی طرح میں کرونگا۔ میں اپنے چچا مرحوم کے نقش قدم پر چلونگا۔ وہ ایک با اُصول شخص تھا۔ تارک الوطن تو وہ بنا مگر یہ دیکھ لو کہ اپنا روپیہ اُس نے غیروں کو نہیں دیا۔ تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلیں مگر روپیہ جمع کیا۔ میرازلیان اُس نے خرید کیا حالانکہ اُس وقت عام طور پر میرازلیان نہیں پسند کیا گیا۔ مگر وہ شخص اپنی دُھن کا پکا تھا اور ایک ارادہ اُس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے عام رائے کا خیال نہ کیا اور ایک جائداد خرید ہی لی۔ میں بھی اپنے چچا (خدا اُسے مغفرت کرے) کی تقلید کرونگا۔ ایک اصول پر قائم رہونگا اور کرونگا وہی جو میرے دل میں آئیگا ⁂

ہلڈا۔ بہت اچھا اب میں زیادہ کچھ نہیں کہتی۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ آج یہ پہلی مرتبہ ہے کہ تم میرے ساتھ اس طرح پیش آئے ہو ⁂

سیسل۔ ہلڈا! تم کس قدر ناانصاف ہو۔ میں تمہارے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہیں آیا۔ تم ذرا سمجھ سے کام لیتیں اور نامعقول باتیں نہ کرتیں ⁂

ہلڈا۔ اچھا میں نامعقول ہی سہی۔ کیا آپ کسی عورت سے معقولیت کی توقع رکھتے ہیں۔ کیا میں حسین ہوں؟ سیسل!

سیسل۔ بیشک حسین ہو ⁂

ہلڈا۔ کیا میں تمہارا دل نہیں بہلایا کرتی؟

سیسل۔ تم ضرور بہلاتی ہو۔ لیکن اُس وقت نہیں جب تم کبھی ضد پر آجاؤ یا اپنے آپ میں نہ ہو ⁂

ہلڈا۔ اچھا جب میں حسین بھی ہوں دلربا بھی ہوں تو پھر آپ مجھ سے معقولیت کی توقع کیونکر رکھتے ہیں ⁂

سیسل۔ پیارے اٹھو کپڑے پہن لو اور جاؤ روپیہ لے آؤ۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے ہائے ہائے یہ ڈریس کس قدر نفیس سلا ہوا ہے ⁂

سیسل۔ ہلڈا! جب میں کسی کام کو نہیں کر دوں تو اُسے میری نہیں سمجھو اور میری ہاں کو ہاں خیال کیا کرو +

ہلڈا۔ تم بڑے کمینے اور خود غرض ہو +

سیسل۔ دیکھو ہوش میں آؤ کیا باتیں کر رہی ہو۔ اس قدر شوخ اور بے ادب نہ بنتی جاؤ۔

ہلڈا۔ کیا بیوی اپنے خاوند کے ساتھ بھی بے تکلف باتیں نہیں کر سکتی؟

سیسل۔ اس وقت نہیں جب خاوند مالدار ہو۔ ورنہ خدا کے عطیے کی ناشکری ہو گی +

ہلڈا۔ کاش یہ دولت تمہارے ہاتھ میں نہ آتی +

سیسل۔ دیکھو ہلڈا اگر تم میرا لحاظ نہیں کرتیں تو میرے مرحوم چچا کا تو پاس ادب کرو۔ میں اس کا جائز وارث ہوں۔ میں اپنے منہ پر اس کی برائی کسی طرح نہیں سن سکتا +

ہلڈا۔ تمہارے چچا کا تمہیں اپنا وارث چھوڑ جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوا۔ کیونکہ جو میں چاہتی ہوں وہی میسر نہیں آتا تو تمہاری دولت فضول اور تمہاری وراثت بے سود۔ بیشک چیزیں خریدنا اس وقت نامناسب تھا جب تمہارے پاس روپیہ نہ ہوتا۔ لیکن جس حالت میں تم اس قدر روپے کا مالک ہو اور اتنی بڑی رقم تمہاری منتظر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنی خواہشیں نہ پوری کروں +

سیسل۔ میری جان ہلڈا دیکھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں تم ذرا ضبط کو ہاتھ سے نہ دو۔ واقعی امیر اور متمول لوگ ہی ایثار اور جبر نفس کی خوبی حاصل کر سکتے ہیں۔ غریبوں کو تو کچھ میسر ہی نہیں آتا لیکن کہہ دیتے ہیں کہ ہم بڑے جابر ہیں۔ میری جان! خوبی اس میں ہے کہ ہر چیز حاصل کرنے کی قدرت ہو اور پھر اپنی خواہشوں پر جبر کرے +

ہلڈا۔ تو کیا تمہیں یہ دولت اسی غرض سے ملی ہے کہ میں اپنے نفس پر جبر کرنا سیکھ لوں؟

سیسل۔ تمہیں یہ غرض نہیں۔ لیکن یہ ایک ضروری امر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر ضرور عمل کرو +

ہلڈا۔ اچھا معاف کیجئے۔ میں یہ نیکیاں اور خوبیاں سیکھنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی موجودہ حالت میں ہی خوش ہوں۔ بلکہ میری یہی تمنا ہے کہ تم میرے ساتھ اسی طرح پیش آؤ جس طرح

تم کھانے سے پہلے تھے۔

سیسل۔جان من! میں کبھی تم سے سختی سے پیش آنا نہیں چاہتا۔لیکن ہماری اُس وقت کی اور اس وقت کی حالت میں ضرور فرق آگیا ہے۔میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہماری آمدنی اب بہت بڑھ گئی ہے اب تمہاری سب خواہشیں پوری ہوجائینگی۔اور میں تمہیں جو کچھ کہوگی لے دوں گا۔

ہلڈا۔مجھے تو تم وہی پوشاک لے دو۔

سیسل۔خیر اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ایک غریب آدمی کو تو ضرور اچھا لباس رکھنا چاہیئے اس کے بغیر اعتبار نہیں جمتا اور قرض کے ملنے میں بھی بہت آسانی ہوتی ہے۔لیکن اب قرض کی ضرورت ہی نہیں رہی۔اس لئے عمدہ لباس کی طرف اسقدر فوری توجہ بیفائدہ ہے۔

ہلڈا۔یہ کیا بیہودگی ہے؟

سیسل۔مجھے یاد ہے ایک لکھے پتی کی نسبت میں نے کہیں پڑھا تھا۔کہ اس کے کپڑے ایسے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے ہوا کرتے تھے کہ بہت سی عورتیں اُسے مفلس سمجھ کر پیسہ پیسہ چندہ کردیا کرتی تھیں۔

ہلڈا۔اس کا کیا ذکر ہے وہ ہوگا ہی ایسا خبیس۔

سیسل۔غالباً اس کو نئے کپڑوں سے نفرت ہوگی ورنہ کیا اسے نئے کپڑوں کی توفیق نہ تھی یا کچھ اور۔غرض اپنا اپنا مذاق ہے۔

ہلڈا۔میں تو پرانے کپڑے نہیں پسند کرتی اس وقت خدا کے فضل سے مجھے توفیق حاصل ہے کہ نئے کپڑے بنوا سکوں۔

سیسل۔میری جان میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تمہاری کوئی خواہش پوری نہ ہو۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ ذرا کی ذرا تم ٹھہرو اور تھوڑی دیر انتظار کرو۔

ہلڈا۔لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ ڈریس جس کی مجھے ضرورت ہے میرا انتظار نہ کریگا۔

سیسل۔تو وہ ڈریس ہمیں پھر نہیں مل سکتا۔

ہلڈا۔ان باتوں سے مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔مجھے اس بات کا اب یقین نہیں کہ تمہارے دل میں میری محبت اتنی بھی باقی رہی ہو جتنی اُڑد پر سفیدی۔

سیسل ۔ کیا خوب ؛ محبت کا امتحان اس طرح نہیں ہو سکتا کہ میں سب کام تمہارے منشا کے مطابق ہی کروں ۔ تمہاری درخواست کا نامنظور کرنا ہی اکثر اوقات اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ مجھے تم سے کیسی غضب کی محبت ہے ۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کی ذرا ذرا سی شکر رنجیوں سے ہماری اس گہری محبت اور رشتۂ یگانگت میں کسی قسم کا فرق نہ آسکے گا ۔

ہلڈا ۔ میں باز آئی اس گہری محبت سے ۔ جناب عالی! رشتۂ محبت ہرگز ایسا مضبوط نہیں کہ ٹوٹ ہی نہ سکے ۔ یہ تو ایسا کچا دھاگہ ہے ۔ جو ذرا سی کشیدگی سے کئی ٹکڑے ہو سکتا ہے ہاں یہ رشتہ اس وقت نہیں ٹوٹ سکتا جب تک دونو طرف سے ڈھیلا چھوڑا ہوا ہے

سیسل ! میں تو اب تمہاری صورت دیکھنے سے بھی بیزار ہوں ۔ افسوس تم بڑے عیار نکلے ۔

سیسل ۔ عیار ۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا عیاری ہے ۔ لیکن اس شخص کے لئے جو نہ صرف ایک دیوان ایک ناول اور ایک ڈرامے کا مصنف ہو بلکہ اپنے چچا کے ورثے سے تین لاکھ روپیہ کا بھی مالک بنا ہو ۔ بیشک اس کے لئے ایسے الفاظ قابل برداشت ضرور ہیں ۔ اور تم اسی کو عیار کہتی ہو ۔

ہلڈا ۔ جانے میری بلا کہ تمہارے چچا کون تھے مجھے ان کی کیا پروا ہے ۔ میں کیا جانتی ہوں کسی کو ۔ غرض ۔ تم بڑے چالاک دھوکے باز اور فریبی شخص ہو ۔ میں تمہاری ان سب کتابوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں ۔ لو ۔ خدا کی شان تم ابھی سے اس قدر مغرور ہو گئے ۔ ابھی تو تم نے روپے کی صورت بھی نہیں دیکھی دیکھ لو گے تو خدا جانے پھر کیا قہر توڑو گے ۔ ستیاناس جائے اس روپے کا جس نے تمہارا سر پھیر دیا ۔

سیسل ۔ دیکھو ۔ دیکھو زر علیہ السلام کی شان میں ایسے الفاظ نہ کہو ۔ آج کل روپیہ کی توہین کفر میں داخل ہے ۔

ہلڈا ۔ اوہ ۔ میں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی ۔ تم ایسے عالی ظرف نہیں کہ پیسہ تمہیں مل جائے اور تم ضبط کر سکو ۔ تمہاری کم ظرفی اسی بات سے نظر آ رہی ہے کہ تم بات بات میں اپنا چھچھورا پن ثابت کر رہے ہو ۔ نو بجے تمہاری کیا حالت تھی اور اب گیارہ بجے ہیں دیکھو کتنا فرق آ گیا

ہے۔ اور . . . اگر تمہارے مزاج کی ترقی کی رفتار یہی رہی تو مجھے یقین ہے کہ ہماری تمہاری جوتی پیزار ہو جائیگی۔ بلکہ ساڑھے تین بجتے بجتے میرا تمہارا تعلق ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائیگا۔

سیسل۔ تم نے تو یونہی بکواس لگا رکھی ہے ؛

ہلڈا۔ بکواس۔ کیا تمہیں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ تمہارے چچا کے انتقال نے میری عمر بھر کی خوشی پر پانی پھیر دیا۔ میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور میری اُمیدوں کا خون ہو گیا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس ایک واقعہ نے میرے تمام عیش کو منغص کر دیا۔ اس سے پیشتر غریب تھے نادار تھے مفلس تھے۔ قلاش تھے۔ لیکن مزے سے زندگی تو بسر کرتے تھے۔ ایسے ہی موقعے تو ہوتے ہیں جہاں انسان کی شرافت اور اصالت کا امتحان ہوتا ہے۔ کمینے کمظرف کا پیٹ پھٹ جاتا ہے۔ دماغ میں فرعونی ہوا سما جاتی ہے اور وہ اپنی پہلی درماندگی کی حالت کو بھول کر غرور و نخوت کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ لیتا ہے۔

سیسل۔ دیکھو ہلڈا! تم مجھ کو بُرا بھلا کہہ لو لیکن میرے چچا کو کچھ نہ کہو۔ اُس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے وہ واقعی ایک ممدوح اور محسن تھا۔

ہلڈا۔ خیر میں یہ باتیں نہیں جانتی۔ ذرا سمجھاؤ تو اُنھوں نے کونسی ایسی قابل تعریف بات کی تھی۔

سیسل۔ واہ۔ اُس نے میرا دیوان خرید لیا اور ابھی اُس نے کوئی اچھا کام ہی نہیں کیا۔

ہلڈا۔ روپے کا استعمال آپ قابل تعریف سمجھتے ہونگے لیکن میرے خیال میں تو اُس نے ضائع ہی کیا۔ اسی پر پھر تم کہتے ہو کہ وہ بڑا نیک اور دانا آدمی تھا۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ ہفتہ آیندہ تک تم بھی ویسے ہی بن جاؤ گے۔

سیسل میرے خیال میں اس بحث کو اب چھوڑ دیا جائے۔ اِس میں کچھ فائدہ نہیں۔ ہلڈا! میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تمہیں اپنے خاوند کی اطاعت کا کچھ خیال ہے جو تم پر فرض ہے ؟

ہلڈا۔ چھ چھ۔ تم ایک نہایت بیوقوف سڑی خود غرض اور خود رائے شخص ہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

(ہلڈا باہر چلی جاتی ہے)

سیسل۔ (دل ہی دل میں) افسوس غریب ہلڈا! یہ انقلابات واقعی ایک عورت کی عقل کو

چکرا دیتے ہیں۔ واقعی تین سو روپیہ ماہوار سے دس ہزار روپیہ ماہوار کی ترقی ایک بھلے چنگے مرد کو حیران کر دیتی ہے تو یہ تو پھر عورت ہے۔ البتہ مجھے اِس بات کا ضرور رنج ہے کہ میں نے اسے ناراض کر دیا۔ لیکن اس طرح روپے کے لئے وہاں جا کر تقاضا کرنا بھی بہت معیوب تھا۔ گویا اِن کو یہ جتانا ہے کہ مَیں نے روپیہ کی صورت ہی کبھی نہیں دیکھی۔ سہ پہر کو معمولی وقت پر مَیں وہاں جاؤں گا اور سرسری طور پر کہہ دوں گا۔ (اُدھو لہجے وقت یاد آیا) ہاں صاحب! وہ کچھ روپیہ ہمارا آپ کے پاس بھی ہے نا"۔ گویا مَیں اس طرح طلب کروں گا۔ جس طرح کسی کی چھتری کسی کے ہاں رہ جائے۔ اور وہ اُس کے متعلق پوچھتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ روپیہ جس وقت ملا اِس کے سنبھالنے میں ضرور دقت ہوگی۔ خرچ کرنے میں بھی ایک اُلجھن ہوگی اور جس وقت روپیہ پاس آیا تو ہزاروں جھمیلے اور خدشے اس کے ساتھ آئے۔ مثلاً کہیں نقب زنی کا اندیشہ کہیں سوداگروں کی کمپنیاں اِن کے حصّوں کے خرید کرنے کے لئے مجبور کریں گی۔ اِن کی دیکھ بھال اور پھر ان نادہند کمپنیوں سے روپے وصول کرنے کی غرض سے وکیلوں کی فیسیں اور پھر کہیں قرض مانگنے والوں کی بھرمار بڑے بڑے مہذب گداگر آئیں گے اور پھر دُنیا میں ہر شخص میرا رشتہ دار بن جائیگا۔ غرضیکہ بہت سی مصیبتیں نظر آ رہی ہیں۔ اور پھر ہلڈا ہے جو ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہے گی۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ چچا مجھے اپنا وارث نہ کر جاتے مگر اب کیا کیا جائے۔ مرحوم کی دلشکنی بھی تو میں نہیں کر سکتا۔ اچھا جس طرح ہوگا تیس لاکھ روپیہ سنبھال لوں گا۔

ہلڈا ہلڈا۔ بات تو سنو۔

(ہلڈا اندر آتی ہے)

ہلڈا۔ کیوں کیا کہتے ہو۔

سیسل۔ مَیں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ ہم روپے کو کس طرح استعمال میں لائیں۔

ہلڈا۔ وہ روپیہ کیا مل گیا ہے؟

سیسل۔ ابھی تو نہیں۔

ہلڈا۔ مَیں تو یہی کہتی ہوں کہ ابھی اور انتظار کرو۔ پہلے روپیہ تو مل لے۔

سیسل۔ لیکن روپیہ تو بہر حال دو چار گھنٹے میں ہمیں مل ہی جائے گا۔

ہلڈا۔ دو چار گھنٹے تک ملا تو کیا فائدہ۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میرے لئے پھر بے سود ہو گا۔

سیسل۔ اچھا پیاری یہ تو بتاؤ کہ تمہاری سیر و تفریح کی نسبت کیا رائے ہے؟

ہلڈا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ مجھے سیر و تفریح کی کس قدر دھت ہے۔ افسوس تم یہ ذکر ہی چھیڑ کر کیوں میرے دل میں آگ لگاتے ہو۔

سیسل۔ اچھا اب تیار ہو جایئے ہم عنقریب چلیں گے۔

ہلڈا۔ تو خیر میں آجکل سفر نہیں کر سکتی۔ معاف رکھئے۔

سیسل۔ تو تم پھر کیا چاہتی ہو؟

ہلڈا۔ آپ کی نوازش۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔

سیسل۔ پھر بھی بتاؤ تو سہی تم بگڑ کیوں گئیں۔

ہلڈا۔ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ تم پھر ویسے غریب ہو جاؤ۔

سیسل۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ واقعی امیر بننے کی مجھ میں بھی توفیق نہیں۔ اس میں بہت جھگڑے ہیں۔ روپے کی خواہش اور ضرورت تو ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن جب روپیہ مل جائے تو اس کے استعمال اور انتظام کے لئے ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ جب سے یہ سنا ہے کہ میں تیس لاکھ کا مالک ہو گیا ہوں۔ میں کیا بتاؤں۔ ہزار ہزار قسم کے افکار میری جان لئے لیتے ہیں۔ مگر اب کیا کریں۔ اب تو ہم مالک بن چکے۔ ہائے افسوس۔ اگر چچا مرحوم وصیت کرنے سے پہلے مجھ سے استمزاج کر لیتے تو میں ان کا وارث ہونا ہرگز قبول نہ کرتا۔ مگر اب مجبور ہوں۔ ان کی وصیت کا پاس اور اپنے چچا کی اطاعت اس امر کی مقتضی ہے کہ میں چار و ناچار طوعاً کرہاً یہ تیس لاکھ روپیہ اپنے تصرف میں لاؤں۔

ہلڈا۔ یہ باتیں تو میں جانتی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ ہم مفلسی کی حالت میں اس سے بدرجہا خوش تھے اور اب ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

(ہلڈا رونے لگتی ہے)

سیسل۔ تمہیں اب میرے چچا کا ماتم اور سوگ یاد آیا ہے۔ خیر اچھے موقع پر خیال آگیا۔ بیشک

روپیہ ملنے سے پیشتر ہی چاہیئے تھا تاکہ روپیہ تو ہم پر حلال ہو جاتا۔
ہلڈا۔ ہیں! آگ لگے تمہارے چچا کو۔ اس منحوس نے تیس لاکھ روپے دے کر ہمیں اس نوبت کو پہنچا دیا ہے۔
سیسل پھر تم وہی باتیں کرنے لگیں۔

اتنے میں گھنٹی کی آواز اِن کے کان میں آئی

ہلڈا۔ یہ کون ہے۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔

(ہلڈا جاتی ہے)

سیسل۔ آج کے بعد ہمارے پہلے دوستوں میں سے کوئی گھنٹی نہ بجائیگا۔ اور ہمیں اپنی ملاقات سے دق نہ کرے گا۔ بس اب جس وقت یہاں سے ہم نکلے ہم الگ تھلگ مزے کریں گے۔ ہمیں اب کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔

(ہلڈا داخل ہوتی ہے)

ہلڈا۔ ایک چپراسی یہ چھٹی گرین فیلڈ کمپنی سے لایا ہے میرے خیال میں اب تمہاری چچی مرگئی ہوں گی۔ کہو اب کتنے کے وارث ہوئے۔ اس چھٹی کو کھول کر دیکھو تو سہی۔
سیسل۔ (خط کھول کر) پڑھنے لگتا ہے۔

جناب مکرّم بندہ

ہمارے مؤکّل .... مطبع والوں نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ ان کو آپ سے چھ سو روپے بابت اُجرت چھپائی لینے ہیں۔ اگر آپ تین دن تک یہ روپیہ بذریعۂ چک ہمارے پاس نہ بھیجدینگے تو ہم کو اختیار ہوگا کہ ہم بذریعۂ عدالت چارہ جوئی کرکے یہ رقم آپ سے وصول کرلیں۔ حساب مُلاحظہ فرمالیجئے۔ (گرین فیلڈ کمپنی)

درست۔

ہلڈا۔ کیا کوئی اور سمن آیا؟
سیسل۔ نہیں ابھی تو اُس نے دھمکی دی ہے بلکہ ایک بڑا لطیف مذاق کیا ہے۔ گرین فیلڈ کمپنی واقعی خوب کاروبار کرتی ہے۔ اس میں کسی کی رو و رعایت نہیں ہوتی۔ اب خیال کیجئے ابھی

کمپنی کے پاس ہمارے تیس لاکھ روپیہ جمع ہیں اور یہی کمپنی ہم سے چھ سو روپیہ طلب کرتی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ جس وقت انہوں نے یہ خط لکھا ہوگا دل میں کیا کہتے ہونگے۔ کہ ابھی تو ہم نے اِن کے تیس لاکھ روپے کی ان کو اطلاع کی ہے اور ابھی ہم چھ سو روپیہ کا تقاضا کرتے ہیں۔

ہلڈا۔ ہاں مگر یہ ایک اور خط بھی تو ہے سیسل!

سیسل۔ لاؤ وہ بھی دیکھیں۔

جناب مکرم بندہ۔

بجائے اِس چھٹی کے ہمارے محرّر نے غلطی سے آپکو وہ خط بھیجدیا ہے جس میں تیس لاکھ روپے کے ملنے کی اطلاع ہے۔ وہ خط کسی اور صاحب کے لئے تھا اور آپ کے لئے یہ خط ہے جو ہم اب بھیجتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہمیں اِس اتفاقیہ غلطی کے لئے معاف فرمائیں گے۔ اور یقین ہے کہ آپ کو اِس غلطی سے کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی +

گرین فیلڈ کمپنی

ہلڈا۔ ہیں۔ غلطی ؟ تو کیا آسٹریلیا میں تمہارا کوئی چچا نہ تھا۔

سیسل۔ نہیں ہلڈا اُس نے میرا دیوان ہی نہ خریدا ہو گا۔

ہلڈا۔ تو گویا اب تم تیس لاکھ کے مالک نہ رہے۔

سیسل۔ اب کہاں رہے اب تو میرے پاس صرف تین کتابیں اور تین سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہی ہے۔ اُف کس قدر پریشانی ہوئی۔ بس اب تم میرے چچا کا بھی نام نہ لینا۔ مجھے اُس سے کیا غرض۔

ہلڈا۔ ہاں ہاں سیسل! اب رنج نہ کرو۔ مَیں بہت خوش ہوں۔

سیسل۔ واہ تم خوش ہو۔ تیس لاکھ روپیہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

ہلڈا اصل میں تمہارے ہی فضول جھگڑوں نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

ہلڈا۔ اب کیا ہے۔ خیر سیسل! اگر تم واقعی امیر ہو جاتے اور مجھ کو وہ ڈریس نہ لیکے دیتے تو مَیں تمہارا قصور کبھی نہ معاف کرتی۔ ہماری محبت میں ضرور فرق آجاتا۔ اور یہ بات کبھی نہ

رہتی۔

سیسل۔ کیا واقعی یہ بات ہے؟

ہلڈا۔ اب چونکہ تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے اس لئے اب میں وہ پوشاک تم سے نہیں مانگتی۔

سیسل۔ ہاں میری جان میں یقیناً لکھ پتی ہونے کے لئے نہیں بنایا گیا۔

ہلڈا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پھر ویسے ہی ایک دوسرے کے چاہنے والے ہیں۔ خدا ایسی دولت ہمارے نصیب میں نہ کرے جو ہمارے تعلقات میں مخل ہو۔ ہمارے لئے افلاس ہزار درجے مبارک ہے۔ سچ یہ ہے کہ اگر بیوی اپنے خاوند سے تنگدستی اور افلاس میں محبت کرے تو وہ یقینی سچی محبت ہے۔ ورنہ امیروں سے محبت کون نہیں کرتا۔ وہ تو روپیہ دیکر انسان کو خرید لیتے ہیں۔

سیسل۔ ہمیں تو اپنی روکھی سوکھی پسند ہے۔ ہم غریب سہی بلا سے۔ مگر امیروں کی طرح آئے دن کے جھگڑوں میں تو نہیں پڑتے۔

ہلڈا۔ یہ تو خیر تیس لاکھ روپیہ تھا۔ اگر تیس کروڑ کے بدلے بھی ہماری محبت کوئی ہم سے مانگے تو میں ہرگز قبول نہ کروں۔ ہم جب ایک دوسرے کو پیار کر لیتے ہیں تو بس یہ سمجھو کہ دنیا بھر کے غم غلط ہو جاتے ہیں اور طبیعت کو ایسی تسکین اور دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ روپے کی حرص کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ امیر لوگ اس محبت کی قدر نہیں کرتے۔

سیسل۔ واقعی تم سچ کہتی ہو۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں۔ کہ یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہمیں میسر ہے۔ اچھا اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس اس وقت روپیہ کتنا ہے؟

ہلڈا۔ پچیس ۲۵ ہیں۔

سیسل۔ اچھا تو چلئے کھانے سے فارغ ہو لیں اور پھر رات کو اس محلے کو چھوڑ دیں۔ یہاں ہم کو قرضخواہ بہت ستانے لگے ہیں۔

شیخ محمد اکرام

علم کی خوشیاں

تلاشِ حقیقت جزوِ شرافت ہے۔ اور اس کا حصول داخلِ خوبی و زیبائی۔ انسان کے دِل کا یہ پرانا خیال ہے کہ علم دولت سے بہتر ہے اور خیال بڑا گہرا اثر رکھتا ہے اور صحیح ہے۔ جذباتِ انسانی کی اس عجزِ عظیم کو دیکھنا جو مدتِ مدید سے بہ رہی ہے۔ قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب پر غور و فکر کرنا۔ گرمی روشنی اور ہوا پر بحث کرنا۔ آسمان اور زمین کے متعلق جو کچھ انسان نے دریافت کیا ہے اُسے جاننا۔ عالم علم کیمیا سے یہ سُننا کہ خالق نے زمین میں کتنی تعجب انگیز خاصیتیں ودیعت کی ہیں۔ طبیعی دان سے یہ معلوم کرنا کہ اس زمین سے پرے کئی اور زمینیں اتنی دُور ہیں کہ روشنی جیسی تیز رفتار شے بھی آج تک وہاں سے یہاں تک نہیں آئی۔ الغرض ان سب چیزوں کا علم اور اُسی تربیت کا حاصل کرنا جو اُن کے علم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک ایسی شے ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی جوانی کے دِنوں میں بدل و جان کوشش کرنی چاہیئے۔

شعر کی دُنیا کی سیر کرنا اور اس فصاحت سے گرم جوش ہونا جو یونان اور روم کی سلطنتوں پر حاکم تھی۔ بڑی بڑی فلاسفروں کے ساتھ تمام چیزوں کی علت غائی تک جانا اور اس امر کا معلوم کرنا کہ باوجود دُنیا کی بے ترتیبی۔ ظلم اور تعدی کے۔ ایک شے ہے جو کبھی نہ بدلے گی۔ کبھی فنا نہ ہوگی اور ازل تک رہیگی۔ یقیناً ان باتوں کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بے نیند راتیں گذاریں۔ دن کو سخت محنت کریں موجودہ خوشیوں کو نظر انداز کریں۔ ہمیشہ ستانے والی غریبی کو برداشت کریں۔ ظلمت۔ غم اور نفرت سے نہ گھبرائیں۔ میں ان شخصوں سے سوال کرتا ہوں۔ جنہوں نے اپنے دماغ کو اچھی طرح سے تربیت دی ہے کہ آیا اسی تربیت میں اُنہیں ایک قسم کی تسلی حاصل نہیں جو انہیں یہ کہتی ہے کہ بیشک تم اپنی زندگی کے مُدعا کے حصول میں بڑی کوشش کرتے رہے ہو۔ قدرت کا منشا تم نے پالیا ہے۔ تمہارے قوائے عقلی و ذہنی نے اُس کام کو انجام دے لیا ہے۔ جسکی خاطر وہ

تمہیں عطا کئے گئے تھے۔ تم نے اِن کو ہیچ اور نفسانی لذتوں پر خرچ نہیں کیا بلکہ ایسی محنت پر لگایا ہے جو اُن کی فطرت اور اصل کے عین مطابق ہے۔

علم کی زندگی عموماً تکلیف اور گناہ کی زندگی نہیں ہوتی۔ علم کا عاشق کسی شخص پر ظلم نہیں کرتا۔ کسی کی خوشی میں دخل نہیں دیتا۔ اس کی آرزو کسی کو برباد نہیں کرتی اس کا فریب کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ وہ اپنی دُھن میں کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا اور اپنی کامیابی سے ہر شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

جو شخص اپنی زندگی علم کی پری کے حوالے کر دیتا ہے وہ ایک ایسی خوشی حاصل کرتا ہے جس کے ساتھ کوئی ملامت وابستہ نہیں۔ اُسے ایسی خوشیوں پر بلا شبہ نفرت ہوتی ہے جن کا حصول خلافِ ہدایتِ ضمیر عمل کرنے پر مجبور کرے۔ اس کی خوشیاں سب سچی معزز اور بے لوث ہوتی ہیں اور جہاں تک انسان اس تغیر و تبدل کے دور میں ہمیشگی کی اُمید کر سکتا ہے۔ وہ اس قسم کی ہوتی ہیں کہ قسمت بھی انہیں زائل نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ساتھ زندگی بھر لگی رہتی ہیں۔ اس کی نیکیوں بڑھاتی ہیں اور برائیوں کو کم کرتی ہیں۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مجھے علم کا شوق نہ ہوتا تو میں ضرور ایک مفلس ترین مزدور کی زندگی کو بڑے سے بڑے امیر کی زندگی پر ترجیح دیتا کیونکہ انسان کے دل میں آتش پرستوں کی آگ جیسی ایک آگ ہے۔ جو دن رات جلتی رہتی ہے۔ ضرور اس کیلئے کچھ ایندھن چاہیئے۔ کبھی یہ تو علم کا خالص عطر ہوگا یا گندے جذباتِ طبعی۔

اس لئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ علم کو تادمِ مرگ عزیز رکھو۔ میری مراد یہ ہے کہ عزیز رکھو معصومیت کو۔ عزیز رکھو نیکی کو۔ عزیز رکھو چال چلن کی درستی کو عزیز رکھو اس شئے کو جو دولت مند ہونے کی صورت میں تمہاری دولت کو لوگوں کی نظر میں عزیز۔ غریب ہونے کی صورت میں تمہاری غریبی کو معزز بنا دیگی اور ان لوگوں کو تم پر ہنسنے سے روکے گی جن کے سینے نخوت و تکبر سے معمور ہیں۔ عزیز رکھو اس شئے کو جو تمہیں تسلی دیگی۔ تمہیں زینت بخشیگی جو تکالیف اور مشکلات میں سپر ہوگی۔ جو تمہارے لئے تخیل کی دُنیا کا دروازہ کھول دیگی جس میں بڑے بڑے طبیعی دانوں۔ بڑے بڑے مورخوں بڑے بڑے مصنفوں۔ بڑے بڑے

فلاسفروں سے تم ہمکلام ہوسکو گے۔ اور اس دُنیا کی تکلیفوں کلفتوں۔ بے انصافیوں اور ظلم و تعدی کو بھول سکو گے۔

پس اگر کسی نوجوان نے اپنی زندگی کی کشتی علم کے بحر زخار میں چھوڑ دی ہے تو اُسے افسوس کرنا یا ڈرنا نہیں چاہئے۔ اُسے چاہئے کہ اُن تکالیف سے جو علم کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ نہ گھبرائے۔ ظلمت سے نہ ڈرے۔ مشکلات سے بیدل نہ ہو تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں گذارہ کرے۔ غم و افلاس کی کوئی پرواہ نہ کرے اور علم کا پیچھا اس طرح کرے گویا علم ہدایت کا فرشتہ ہے۔

نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ علم اُسے رات کے اندھیرے سے نکال کر دن کے اُجالے میں لے آئیگا اور دُنیا پر ظاہر کر دیگا۔ کہ وہ کتنی وسیع معلومات رکھتا ہے۔ کتنا تجربہ کار ہے۔ کتنا مدلل اور دُور اندیش ہے۔ اس کی قوتِ متخیلہ کتنی طاقتور ہے۔ اُس کے قوائے کیسے عمدہ ہیں اور اس کا سلوک اپنے ابنائے جنس کے ساتھ کیسا اچھا ہے۔

(منشی برکت علی ایم۔ اے لاہور) (ترجمہ از مسٹر بی سمتھ)

کھلتا ہُوا پتّا

اس کی صناعیاں اس کی دستکاری اس کی رنگیلی طبیعت اور ایک سے دوسرے کی صورت نہ ملنے دینے والی قدرت کا ملہ بھی کس شان کی مُوجد ہے کہ ہر خاک میں ایک جوہر ہر جوہر سے ایک تصویر اور ہر تصویر میں وہ وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے جو دیکھ کر عش عش کرنے کے سوا ذرہ برابر بھی نقل نہیں کیجا سکتیں۔

ہَوا و سبزہ و گلہائے رنگین
یہ ساری شوخیاں ہیں اُن ہی کی

اس بھری پُھری دُنیا میں کیا کوئی ایسا چابکدست مصور۔ سائنٹسٹ۔ بوٹینیکل آرٹس کا ماہر۔ باغبان یا مالی موجود ہے جو اک جوہی کے نازک پھول کی نظیر اپنی قوت مدرکہ یا کاریگری سے

بنا سکے؟ کیا اک سادے سے پتّے پر ویسے ہی نرم اور نازک نازک نقش کسی مشین یا دوا کے زور سے پیدا ہو جائیں گے جو ایک معمولی کیلے کے چوڑے پتے پر دیکھے جاتے ہیں۔ ہاں ہاں! امریکا کا مشہور حکیم ایڈیسن جو اپنے قول کے موافق ایک بٹن کے دبانے سے گریٹ برٹن کو اُڑا دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ بلکہ اُس کے بنائے ہوئے عجائبات اس وقت میاحون کیلئے اعجاز اور سحر عالم آشکارا کا مرتبہ رکھا رہے ہیں کیا اس سے یہ ممکن ہے کہ وہ اک چھوٹی سی ہری ٹہنی کو توڑ کر اُس کی جگہ ویسی ہی دوسری لگا دے۔ ایک دن میں نہیں سو دن میں سو دن میں نہیں ہزاروں میں۔ نہیں یہ ناممکن ہے قدرت کے مقابلے میں کس کی مجال ہو سکتی ہے جو اک تنکا بھی بنا سکے۔ قدرت کی صنعتیں۔ زبردست حکمتیں ہیں اور حکمت کی شان ہر ذرّے ذرّے پتی پتی۔ رونئیں رونئیں سے ظاہر ہے اگر دیکھنے والے کو سلیقہ ہے اگر سمجھنے والے کو سمجھ ہے تو وہ دن رات میں کیا کچھ نہیں دیکھ سکتا اور ذرا سے غور میں کیا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ وقت پر لگا کر اُڑ رہا ہے زندگی موت کے دن گن رہی ہے۔ خواہشیں جان لئے لیتی ہیں اور آنکھیں کھلے رہنے پر بھی بند ہیں۔

کھلتا ہوا پتا۔ آیئے میں آپ کو بتاؤں؟ اس سرخی میں کیا بھید ہے اور نفسِ مضمون کو اس سے کیا دست و گریبانی ہے میرے مضمون کو پڑھنے والو! میرے گھر میں ایک ایسے درخت کا گملا ہے جس میں پھول پھل تو نہیں آتا مگر ہاں اس کے پان کے سے پتے لال لال اور بڑے بڑے ہو کر بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ اک چھوٹا سا پودا ہے اس لئے اُس کی بساط کے موافق ہر شاخ میں دو دو تین تین ہی پتے آیا کرتے ہیں مگر وہ بھی باری باری ہے۔ یعنی جب ایک پتہ پورے طور پر اپنی بہار دکھا جاتا ہے تو جل کر گر پڑتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے اِس کے کھلنے کا بھی عالم نرالا ہوتا ہے۔ لال لال ڈنٹھل میں سے پہلے ایک مہین سی ہلکی نوک پیدا ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے نکھرتے نکھرتے کوئی پانچ چھ دن میں ایک سبز بتی سی بن جاتی ہے اور یہی درحقیقت وہ لپٹا ہوا پتا ہوتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ جتنی جتنی نسیم سحر کے پولے پولے ہاتھوں کی ہلکی ہلکی جنبش اور دریادل شبنم کے گول گول موتیوں کی نچھاور اس پر ہوتی

جاتی ہے سورج کی دھیمی دھیمی شعاعیں اِدھر اُدھر سے پڑتی جاتی ہیں اُتنی ہی اتنی یہ پھول سی پتی لمبی ہو ہو کر کھلتی بھی جاتی ہے اور آخر ایک اٹھوارے کے بعد وہی راز سربستہ ایک پنجۂ نگارین ہو جاتا ہے۔ جب یہ کھلنا شروع ہوتا ہے تو اِن کی نیم وا حالت اُن نازک اُنگلیوں کی جھلک مارتی ہے جو حنا کی بدولت خون میں ڈوبے ہوئے نشتر کہلاتی ہیں۔ اِس کی سُرخ سُرخ رگیں جب آپس میں پھیل پھیل کر مل جاتی ہیں تو یہ عین اُس نازنین مظلومہ کا کمزور ہاتھ معلوم ہوتا ہے جس نے قاتل کی ننگی تلوار روکنے کے لئے گھبراہٹ میں اپنی گوری گوری ہتھیلی آگے کر دی ہو اور وہ لہو لہان ہو کر رنگی گئی ہو۔

میرے دوستو! جب تک یہ کھلتا نہیں ہے اور اک سر بند کلی کی طرح رہتا ہے اُس وقت تک میں کیا بتاؤں کہ دن بھر میں کے کے دفعہ میری نگاہیں اِس تک جاتی ہیں۔ اور مایوس پلٹ آتی ہیں یہ کھلنا شروع ہوتا ہے اور میری بیقراری پہلے سے بھی دو چند وسہ چند ترقی کر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل کھل جاتا ہے اور میری لب تشنہ نظریں اس کی رنگینیوں سے لبریز ہو کر بالکل سیر ہو جاتی ہیں پھر وہ اپنی عمر کی پوری میعاد تک برابر کھلا رہتا ہے مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ پھر مجھے اِس کی طرف سے کچھ ایسی مساوات ہو جاتی ہے کہ کبھی بھُولے سے بھی نظر اُٹھا کر اُس کی طرف نہیں دیکھتا ہاں جب کبھی دھیان بٹتا ہے تو کدھر؟ اس دوسری پتی کی طرف اس امید میں کہ دیکھئے وہ کب کھلتی ہے۔ آہا اس میں اک عجیب بھید ہے اس میں اِک طرفہ جدت ہے بلکہ اس میں اچھی خاصی نصیحت پوشیدہ ہے۔ جیسے کھلے ہوئے پتے کے خطوں نے ذرا سے غور کے بعد حرف بحرف کہدیا۔ کمال اور نقص میں کچھ یوں ہی سا فرق ہے کمال کے بعد ہی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی دھیمی نمائش بہت کم دکھائی دیتی ہے صرف مُٹھی کھُلنے کی دیر ہے۔ خدا نہ کرے جو کسی کی مُٹھی کھُلے کلی کلی کی رسیا نگاہیں ساری خوشبو بن کر اڑ جاتی ہیں اور پھر اُدھر بھولے سے بھی نہیں بھٹکتیں۔ رازِ سربستہ جب تک سربستہ ہے بالکل محفوظ اور مقید ہے۔ جہاں اُس کی ذرا سی بُو چھُوٹی اور بس۔ ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔ اپنا راز جان سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ اپنی مُٹھی

کھول دینی سراسر نادانی ہے۔ دوسرے سے اپنا بھید کہہ دینا اُس کا غلام بن جانا ہے۔ بھلا یہ کونسی دانائی ہے کہ اپنی تمام قوتیں اپنا جوش اپنی عزت اپنی آبرو دفعتاً دوسرے کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں۔ دُنیا والو! دُنیا میں بھرم عجب چیز ہے اور بے اعتباری سخت ذلت۔ اپنا بھرم رکھنا گویا دوسروں سے اپنی عزت کرانا ہے۔ اِس لئے اپنے خزانے کی کنجی دوسرے کے جیب میں ڈالدینی دیدہ و دانستہ اس کا محتاج بننا ہے۔ مُٹھی کھُلنے کے بعد کبھی بند نہیں ہوسکتی اور گئی ہوئی خوشی پھر نہیں پلٹتی۔ اپنا راز جب تک اپنے دل میں ہے اُسے ذرا آنچ نہیں اور جہاں دوسرے کو ہمراز بنایا ہمیشہ نگاہیں نیچی ہوئی ہوئی دیکھیں۔ اَے اس نئی روشنی کی جھلک سے ٹٹول ٹٹول کر چلنے والو! کھلتا ہُوا پتا گویا دو دن کی بہار تھا۔ جو پھر دفعتاً نظر سے گر گیا۔ اور نظر سے گرتے ہی جل کر بھاڑ میں آپڑا۔ جہاں سے ہوا نے اُسے زمین پر پھینکدیا اور دوسرے دن جھاڑو کی سینکیں اُسے دروازے سے باہر بھی کر آئیں میں نے اُسے پھر چھوتوں بھی نہ دیکھا کہ اُس کی کیا نوبت ہوئی اور وہ کس درجہ کو پہنچا۔

کیوں کسی غیر کا محتاج بنے او ناداں
ہونٹ سی لے کہ یہاں لذتِ گفتار نہیں

آغا شاعر دہلوی

سیلِ زمانہ

بہے جا، بہائے لئے جا، نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامتی، بسے ہوؤں کے نشان مٹائے جا، تیراکوں ڈبا، غواصوں کو نہ اُبھار، یہی تیرا کام ہے۔

تجھ میں جو خوشنما ہرے ماہرے جزیرے نظر آتے ہیں، جو پھولوں اور پھلوں سے مالامال ہیں، جن میں خوبصورت پرند چہچہا رہے ہیں، کیا یہی لذایذ حیات ہیں؟ وہ حسین سحر کار عورتیں، جو ہاتھ میں ستار لئے دلرُبا گانے گا رہی ہیں، اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف

ہلا رہی ہیں، کیا یہی جوانی کی اُنگلیں ہیں؟ آہ! مجھے اس جزیرے کو دیکھنے دے، ان دیویوں سے، ان پریوں سے تو ملنے دے، ان کے گانے سے اپنے دل کو راحت تو پہنچانے دے! مگر توں کس کی سُنتا ہے! تونے کسی اور تنکے کی سُنی ہے جو میری سُنیگا۔ اچھلنے، تجھے بھی قسم ہے، بہائے لئے جا مجھ کو بھی لئے جا، ذرا ٹھہر۔

مگر یہ تو بتا دے، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے، کب سے لا رہا ہے، کیوں لا رہا ہے، کب تک بہائے گا؟ ....

یہ کیا، کیا اور تیزی سے بہنا، بھنور میں پڑنا، طوفان کا اُٹھنا، موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا، میرے سوالوں کا جواب ہے؟ تجھے میرے سوالوں سے غصہ آگیا؟ میں نے بے ادبی کی؟ اچھا، جواب نہ دے، بہے جا، بہائے جا،

میری روح متجسس، مدید نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے، نینوا، بابل، قدیم ہند، قدیم مصر کے ٹکڑے تجھ میں نظر آتے ہیں، واعظ کہتا ہے "باطل، باطل، سب باطل ہے"!

"سکندر، ہنیبال، نوشیرواں، دارا" تیری موجوں سے کبھی کبھی ان آوازوں سے ملتی جلتی آوازیں آتی ہیں۔ کیا شہرتِ رفتگان یہی ہے؟ فلاسفر کہتا ہے، دھوکا، دھوکا، سب دھوکا ہے شہرت دھوکا ہے، نام و نمود دھوکا ہے، خود زندگی دھوکا ہے"!

لیکن نہیں، میں ملل سابقہ کو باطل، شہرتِ رفتگان کو دھوکا سمجھتا ہوں۔ اُن کی شہرت ہمت بڑھاتی ہے، لیکن یہ خیال کر کے کہ کیا ہوں میں اور کیا ہے میری ہست و بود، دل بیٹھ جاتا ہے۔

اِس لئے بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح، جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے بہے جاؤں۔

پس اَے سیلِ زمانہ، بہے جا، بہائے لئے جا، اور اُس بحرِ ناپیدا کنار میں، اُس عمانِ عظیم الشان میں، اُس اوقیانوس ابد میں، اب یا جب تیرا دل چاہے گرا دے،

یلدرم از بغداد

اخلاقی جرأت

جرأت | جُرأت یا دلیری کا بڑا تعلق دل سے ہے۔ اور جرأت یا دلیری کا وجود اُس خیال پر منحصر ہے۔ جو ہمیں اپنا کام بے کھٹکے جاری رکھنے کی تحریک دیتا ہے۔ جرأت دو اقسام پر منقسم ہو سکتی ہے:۔

جسمانی جرأت | (۱) جسمانی یا قدرتی جرأت۔ یہ وہ جرأت ہے جس کے بغیر سپاہی میدانِ جنگ میں اپنے کرتب اور فن نہیں دکھا سکتا۔ مثال کے طور پر ہم اس جگہ پومپی آئی کے سنتری کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ کوہ آتش خیز دسودیس انگارے اور جھلسنے والا لاوا اپنے رہ عدم کے ناکوں سے باہر پھینک رہا تھا۔ لوگ اس آفتِ ناگہانی سے پناہ حاصل کرنے کے لئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نہایت ہی سراسیمگی اور خوف وہراس کی حالت میں بھاگتے پھرتے تھے۔ اور تمام کوششوں کے باوجود اس بلائے آسمانی سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ لیکن واہ رے سنتری! تیری ماں نے تجھ ہی کو جنا تھا! تو اپنی جان کا خوف نہ کھا کر لوگوں کو بچانے میں نہایت ہی سرگرمی سے کام لے رہا ہے۔ اور اپنے فرائضِ منصبی نہایت ہی مستعدی سے ادا کر رہا ہے۔ افسوس! اس جوانمرد اور جری سپاہی نے سینکڑوں مرد و زن کے اوپر سے اپنی جان تصدق کی۔ اور اسی کھینچا تانی کی حالت میں اپنی پیاری جان نہایت ہی جوانمردی سے لاوا کے نذر کی۔ اب احمد نگر کی چاند بی بی کی دلیری کو ملاحظہ فرمائیں۔ جس وقت مغلوں نے شہر کی چار دیواری پر دانت پیس پیس کر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور قریب تھا۔ کہ احمد نگر کی فوج اس حملے کی تاب نہ لا کر ہتھیار ڈال دے۔ ٹھیک اُس دم یہ نیک اور جاں نثار بی بی زرہ بکتر پہن آلاتِ حرب سے جسم کو مزین کر ہاتھ میں تلوار پکڑے شگاف پر آموجود ہوئی۔ اور اپنے سپاہیوں کو جوشیلے الفاظ سے بڑھاوے دینے لگی۔ اور مغلوں سے ایسی جان توڑ کر لڑی کہ اُن کے چھکے چھوٹ گئے۔ لاچار مغلوں کی سپاہ کو منہ کی کھا کر واپس بھاگنا پڑا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیک اور پارسا بی بی نے

اپنی جسمانی یا قدرتی جراُت کی وجہ سے ایسی لازوال شہرت حاصل کرلی ہے کہ چار دانگ عالم میں اس کا نام گونج رہا ہے۔ اور لوگ اس کو بڑی عزّت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اخلاقی جراٗت (۲) اخلاقی جُراٗت کو ہماری عادات سے خاص تعلق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو لوگ جسمانی جراٗت کے مالک ہیں وہ اخلاقی جراٗت سے بھی غلامی کا پٹہ لکھوالیں۔ بہت سے سپاہی لڑتے ہیں بیباک ہوتے ہیں لیکن تاب نہیں لاتے کہ اپنے ہچشموں کے مزاج اور دل لگی اور ہنسی کا مقابلہ کرسکیں۔ برعکس اس کے ایسی نازک بدن گل اندام بیبیاں بھی ہیں جن میں انتہا درجے کی اخلاقی جراٗت پائی جاتی ہے۔ اس سے وہ بہادری مراد ہے۔ جو انسان کو ایماندار اور راست گفتار اور قرض سے محترز اور ہوائے نفسانی کا دشمن ہونے اور اپنے فرائض کو باحسن الوجوہ انجام دینے کی تحریک دیتی ہے۔

اخلاقی کم ہمتی اخلاقی جُراٗت کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان کے چال چلن میں بڑا بھاری نقص واقع ہوجاتا ہے۔ اور طاقتِ ارادی کچھ ایسی کمزور اور قریب قریب باطل پڑجاتی ہے کہ حالانکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ درست راستہ ہے اور دل سے چاہتا بھی ہے کہ میں ایسی راہ مستقیم کا رہرو بنوں اور ٹیڑھے رستے کو بُرا سمجھتا ہے اور اُس سے پرہیز کرنا چاہتا ہے لیکن پھر بھی وہی ٹیڑھا رستہ بصد ناز و ادا اس کو اپنی طرف کشاں کشاں لئے آتا ہے۔ اور اِس میں اتنی اخلاقی جراٗت نہیں ہوتی کہ اُس بیجا طریق سے نہایت ہی بہادری کے ساتھ پرے ہٹ جائے۔ یہاں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند ایک نظیریں اخلاقی جراٗت اور اخلاقی کم ہمتی یا بُزدلی کی ہدیۂ ناظرین کریں۔

اخلاقی جراٗت کی مثال پہلے پہل اخلاقی جراٗت کا ظہور یقیناً راست گفتاری میں ہوتا ہے۔ اگر ہم نے کوئی قصور کیا ہو لیکن بغیر کسی شرم یا حجاب کے اُس قصور کا نہایت ہی پاک باطنی سے اعتراف کریں تو یہ اخلاقی جراٗت کی ایک بڑی مثال ہے۔ دروغ گوئی اور فریب عموماً نتیجے ہیں بُزدلی کے۔

اخلاقی کم ہمتی کی مثال مندرجہ ذیل مثال اخلاقی کم ہمتی کی ایسی مثال ہے جو عموماً ہندوستان کے ہر قبیلے اور ہر فرقے کی طرزِ معاشرت پر عاید ہو سکتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے

کہ اگر قبیلوں کے سرپرست اور بزرگ اخلاقی کم ہمتی کے ہاتھ نہ بک جائیں تو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حالت میں ایک عظیم اصلاح ہو جائے۔ مثال اخلاقی کم ہمتی کی یہ ہے کہ ایک باپ کو اپنی لڑکی کی شادی عنقریب کرنی ہے اور اُس کی ماہواری آمدنی صرف پچاس روپے ہے اور بدقسمتی سے وہ اب تک ایک پائی بھی شادی کے لئے نہیں جمع کر سکا۔ لیکن اُس کی ظاہری حیثیت اِس بات کی مقتضی ہے کہ وہ شادی میں پانسو روپیہ صرف کرے۔ تو پھر اُسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا وہ نہائت ہی دلیری سے کہہ دیتا ہے کہ میرے پاس شادی میں اتنا روپیہ لگانے کو نہیں دھرا ہے اور یہ عین حماقت ہے کہ شادی کے لئے قرض دام لیکر رات دن کی فکر کا شکار رہوں؟ نہیں بلکہ ایسے اعلیٰ خیالات والے چند ہی بندے خدا کے ہیں ورنہ ایک بڑی تعداد لوگوں کی ایسے موقع پر اپنی ناک ساک کی خاطر بیدھڑک روپیہ قرض لے لیتی ہے۔ اور انجام پر ذرا غور نہیں کی جاتی۔ اور ایسے لوگ نہائت ہی بزدلی اور جہالت سے اپنی گردن قرض کے جوئیے کے نیچے دبا لیتے ہیں۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

برخلاف اس کے جس شخص میں اخلاقی جرأت ہوتی ہے وہ اپنی بساط سے زیادہ خرچ ہرگز نہیں کرتا اور وہ قرض کے وبال سے خود ہی نہیں بچا رہتا۔ بلکہ وہ اپنے ملکی بھائیوں کے لئے خود ایک زندہ مثال بنتا ہے اور اس طرح اُن کو اخلاقی جرأت کا سبق سکھاتا ہے۔

ریفارمر اور اخلاقی جرأت

ہر زمانے اور ہر وقت میں ریفارمروں کو اخلاقی جرأت کی انتہا درجے کی ضرورت پڑتی رہی ہے۔ بہت دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ان کو تمام عمر ملزم قرار دیا گیا ہے۔ بعض کو جیلخانوں کی کڑیاں اور مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ اور بہت سے ریفارمروں نے اپنے ایمان اور عقیدے پر اپنی جانیں نثار کر دی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دُنیا کی بہبودی کی مشین کے پہیئے ہیں اور دُنیا کی تاریخ میں ان کے نام نہایت ہی عزت کے ساتھ ابدالآباد تک قائم رہیں گے اور سخت سے سخت مصیبت اور دشوار سے دشوار مہم میں لوگوں کی دستگیری اور رہبری کریں گے۔

مارٹن لوتھر

اخلاقی جرأت کے کرشموں کا اثر ناظرین کے دل پر قرار واقعی طور پر جمنے کے لئے

ہم ان کو مارٹن لوتھر کے زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ پراٹسٹنٹ مذہب کا وہ چوٹی کا رفارمر ہے جس کی عظمت کا سکہ یورپ کے ہر گوشے اور ہر طبقے میں بیٹھ گیا ہے۔ لوتھر ۱۰ نومبر ۱۴۸۳ء میں بمقام ایسلیبن (واقع سیکسنی) پیدا ہوا۔ جب بڑا ہوا تو باپ کے حکم کے موافق قانون کے مطالعہ کی جانب رجوع کیا۔ لیکن جب اسی کا ایک عزیز دوست بجلی کے گرنے سے اسکی آنکھوں کے سامنے مرا تو اس کا دل دُنیا کی تمام دلچسپیوں سے اُچاٹ گیا۔ اور اس نے بمقام ارفرٹ ایک خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہاں رہتے ہوئے لوتھر کو بہت عرصہ نہ ہوا تھا کہ ایک دن حسنِ اتفاق سے ارفرٹ کے کتب خانے سے ایک پُرانی بائبل لاطینی زبان کی اس کے ہاتھ لگی۔ اور اس بائبل کے پڑھنے سے لوتھر کو یہ واضح ہوا کہ رومن کیتھلک مذہب کے تمام طریقے بالکل لغو ہیں اور پوپ کی حد سے زیادہ عظمت اس کی نگاہ میں بیجا معلوم ہوئی۔ چنانچہ اب وہ پوپ کی شان و شوکت اور جبروت کے مٹانے پر تُل گیا۔ پوپ نے کئی مرتبہ اس کو کبھی نرمی سے اور کبھی غیظ و غضب سے یہ کہا کہ تو ان حرکات سے باز آ اور پھر یہ دھمکی بھی دی کہ میں تجھ کو زندہ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالوں گا۔ آخر لوتھر نے ۱۵۲۱ء میں ورمز کے مذہبی مجمع کے روبرو ایک لیکچر نہایت جوشیلے الفاظ میں دیا اور اس عام جلسے میں اپنے نئے مذہب کے اصول حاضرین کو سمجھائے۔ اور آخر میں کہا کہ "جن مذہبی اصول کی میں تلقین کرتا ہوں۔ اُن کا اقتباس میں نے خدا کے پاک کلام یعنی بائبل سے کیا ہے اب میں اپنے ایمان سے ہرگز دست بردار نہیں ہو سکتا۔ چاہے پوپ اور دُنیا کے بادشاہ مجھ کو پابزنجیر زمین دوز جیلخانوں میں مقید رکھیں خواہ زندہ گاڑیں اور چاہے وہ جیتے جی جلا کر میرا نام و نشان تک باقی نہ رکھیں"۔

ذرا ایک لمحے کے لئے خیال کرو کہ لوتھر کے گرد مخالفین کا ایک انبوہِ کثیر جمع ہے جس میں ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں۔ شہنشاہ چارلس پنجم بھی وہاں ہے اور جرمنی کے تمام شہزادے اور پوپ کے قاصد اور بڑے بڑے حکامِ وقت کی نگاہیں بھی لوتھر کے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔ ایسے ذی اقتدار لوگوں کے سامنے مندرجہ بالا کلمات کا لوتھر کی زبان سے نکلنا اُس کی اخلاقی جرأت کا بڑا بھاری ثبوت ہے۔

سائنس اور اخلاقی جرأت سمائلز لکھتا ہے کہ دُنیا کی تمام بڑی بڑی مہمیں اخلاقی جرأت نے ہی سر کی ہیں۔ ہر قوم کی تاریخ کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ کوشش کے میدان میں ترقی کے قدم اُن لوگوں نے ہی بڑھائے ہیں جو دل کے دلیر تھے اور اخلاقی جرأت اپنے حصے میں رکھتے تھے۔" سُقراط نے نیکی اور حیاتِ جاودانی کی نسبت اپنے شاگردوں اور عوام الناس کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دی تھی۔ لیکن یہ تعلیم اس زمانے کے لوگوں کے خیالات کے خلاف تھی۔ گورنمنٹ نے اُس کو متنبہ کیا کہ اس قسم کی تعلیم سے باز آئے۔ سُقراط نے انواع واقسام کی سختیاں جھیلیں لیکن اپنے اصول کی تلقین سے نہ پھرا۔ آخر حسب الحکم گورنمنٹ اس دلیر شخص نے زہرِ ہلاہل کا پیالہ پی کر اپنی جانِ شیریں کو خیرباد کہا۔ لیکن مرتے دم تک شاگردوں سے اپنے عقیدوں اور اصولوں کا تذکرہ کرتا رہا۔ گلیلیو نے جو اطالیہ کا ایک بلند پایہ منجم گذرا ہے۔ لوگوں میں عام طور پر یہ مشتہر کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد پھرتی ہے۔ اِن الفاظ کے عوض جو مظالم اس کو سہنے پڑے تھے اُن سے وہ قریب قریب نیم مردہ ہو گیا تھا۔ غرض اسی طرح نیوٹن کو بھی جرِ ثقیل کی دریافت پر کافر قرار دے کر مجرم تصور کیا تھا۔ حالانکہ نیوٹن صاف دلی اور پاک باطنی کے لحاظ سے تمام دُنیا میں مشہور ہے۔ لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر یہ سائنس دان حضرات سائنس کی معلومات کو اپنے سینوں میں دفن کیے ہوئے دفن ہو جاتے تو پھر ہمیں اِن نئی معلومات سے محروم رہنا ہوتا۔ اور سائنس کی ایک بڑی شاخ معرضِ ظلمت میں رہ جاتی۔

ہم اور اخلاقی جرأت اپنے طریق واطوار اور ڈھنگوں کو درست کرنے کے لئے ہمیں اخلاقی جرأت کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ نفسانی خواہشیں انسان کی جانی دشمن ہیں۔ مرتے دم تک ہم اپنی خواہشوں کی کشمکش اور اُلجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں اور اگر ہم میں اخلاقی جرأت موجود ہے تو ضرور ان نفسانی خواہشوں کو نیچا دکھاتے ہیں۔ اور اس طرح سے اپنی تمام زندگی کو اخلاقی عیوب سے مُبرّا کر لیتے ہیں۔

اخلاقی جرأت کے حاصل کرنے کا وسیلہ اس وقت بار بار جو سوال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "ہم اخلاقی جرأت کو کیونکر حاصل کر سکتے ہیں"؟ اگر نفس کا شیطان تمہیں دھوکا

دیکر اپنے دام گلوگیر میں پھنسانا چاہے۔ اور تم اُس کے دھوکے میں نہ آؤ بلکہ "نہیں" کہکر اس کا دل جلاؤ تو یہ اخلاقی جرأت کا پہلا کرشمہ ہوگا جو تمہاری جانب سے ظہور میں آئیگا۔ اب جتنی مرتبہ تم نفس کشی سے اپنے فرائض کے سرانجام دینے کی طرف متوجہ ہوگے اُسی قدر اخلاقی جرأت تمہارے دل و دماغ میں طاقت پکڑتی جائیگی۔ لیکن نفس کی شرارتوں کو سہنے سے نتیجہ برعکس پیدا ہوگا۔

ایک مفید نصیحت | ہر کام کے کرتے وقت اور ہر بات کے کہتے وقت اگر ہر شخص مندرجۂ ذیل نصیحت کو اپنے خیال میں رکھے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو۔ وہو ہذا :-

"جوانمرد اور مستقل مزاج بنو اور ہر کام صرف خدا سے ڈر کر کرو۔ جو کام تم کرو اور جو بات تم کہو اُس کے کرتے اور اس کے کہتے وقت اپنے دل سے یہ سوال کرو۔ کیا "جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں یا کہنا چاہتا ہوں درست ہے"؟ اگر تمہارا دل جواب میں "ہاں" کہے تو پھر بہر صورت لوگوں کی مخالفت کے باوجود وہ کام کرو اور وہ بات کہو۔ ممکن ہے کہ تمہارے بعض رفقا تمہارے مخالف ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ لوگ تمہیں حسب دستور عزت کی نگاہ سے نہ دیکھیں لیکن تم ان سب باتوں کی کچھ پرواہ نہ کرو مستقل مزاج رہو اور مرد بنو۔ خدا تمہاری مدد پر ہے تمہیں اس بات کا ذرا خیال نہ کرنا چاہئے کہ لوگوں کا تمہاری نسبت کیا گمان ہے۔ صرف یہ خیال ہمیشہ رکھو کہ تمہارا مدعا ایمانداری پر مبنی ہو۔ اور اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کو اپنا فرض سمجھو۔ جو دل دُنیاوی آلائشوں سے پاک ہے وہ جرأت بھی ضرور رکھتا ہوگا کیونکہ پھر اُسے ڈر کس کا ہے؟ اخلاقی جرأت سے ایسا طریقہ اختیار کرو کہ زندگی کا دشوار گذار سفر آسان ہو جائے۔"

خاتمہ | بقول سمائلز بات ساری یہ ہے کہ جوانمرد اور دلیر لوگ ہی خدا کے ایسے بندے ہیں جو انسانی زندگی میں جان ڈالدیتے ہیں اور وہ ہی دنیا کی حکومت اور رہبری کے قابل ہیں۔ مرنے کے بعد کمزوروں اور ڈرپوکوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ لیکن ایک راست گفتار سچے اور صاحب جرأت شخص کی زندگی اس کے مرنے کے بعد

بھی ایک ایسا روشن رستہ ہے جو دُنیا کے بھولے بھٹکے مسافروں کی رہبری کریگا اور
اُس ولاور شخص کی سوانح عمری ایک ایسا دلچسپ سبق ہے جس کو دُنیا کے سب لوگ شوق
سے پڑھیں گے۔ اور اُس کے خیالات اور اُس کے جوش اور ولولے اور اس کی اخلاقی جرأت
اپنے فائدہ بخش اثر سے نسلاً بعد نسلٍ لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتی رہیگی ؎

زندہ است نامِ فرخ نوشیرواں بعدل		گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

ڈپٹی لال نگم

ہماری "اسپرانٹو"

یورپ میں آجکل ایک نئی زبان کا بہت چرچا ہے۔ جسے "اسپرانٹو" کہتے ہیں۔ شاید دُنیا میں یہ پہلی مصنوعی زبان ہے۔ جو کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ گو زبانوں کی جڑ کو دیکھیں تو سب زبانیں کم وبیش مصنوعی ہیں۔ ان کی ابتدائی حالت میں چند انسانوں نے ضرور یہ قرار دیا ہوگا کہ زبان ولب کی فلاں حرکات سے فلاں معنے لئے جائیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کونسی زبان کس زمانے میں اس حالتِ ابتدائی میں تھی۔ بلکہ عام طور پر ہر قوم کی زبان اس قوم کی زندگی کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ جب سے اُس قوم کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اُسی وقت سے اُس کی زبان اُس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ حالات کے تغیر کے ساتھ تغیر پاتی ہوئی بہ تدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اور اہل بصیرت کے لئے اس قوم کی زندہ تاریخ ہوتی ہے۔ مگر ایسا کم سُننے میں آیا ہے کہ کوئی ایک شخص ایک زبان ایجاد کرے یا چند آدمی مل کر ایک زبان گھڑ لیں۔ اور اس کے قواعد منضبط کریں اور اس کے بعد اس کی اشاعت کی کوشش کریں۔ اور یہ بنائی ہوئی زبان مقبول ہو جائے۔ اختلافِ السنہ سے جو مشکلات سیر وسیاحت اور تجارت کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ اُن سے بچنے کے لئے ایک مشترکہ زبان ایجاد کرنے کی کوشش کئی مرتبہ یورپ میں ہو چکی ہے مگر ناکام رہی۔ یہ آخری کوشش جو "اسپرانٹو" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روسی عالم کی

محنت کا نتیجہ ہے۔ علّامۂ موصوف نے روسی اور فرانسیسی ۔ انگریزی ۔ جرمن اور اطالین زبانوں کی آمیزش سے یہ زبان پیدا کی ہے اور اس کے صرف و نحو کو بالکل باقاعدہ اور آسان بنا دیا ہے۔ کوئی استثنائی قواعد اس میں داخل نہیں کیے جن سے طالبِ زبان کو دقت ہو اور اس کا "اسپرانٹو" نام رکھا ہے۔ یہ اطالین زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں امید۔ چونکہ اس کے بانی اور اس کے معاونوں کے نزدیک اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ یورپ کی مشترکہ زبان ہونے میں کامیاب ہو گی۔ اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ایک رعایت اس نام میں اور رکھی ہے اور وہ یہ کہ اس زبان میں یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ سب اسما حرفِ واؤ پر ختم ہوں۔ اور اس لئے اس نام سے زبان کی ماہیت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جب زبان پہلے پہل ایجاد ہوئی تو اکثر لوگ اس کی ہنسی اڑاتے تھے اور کہتے تھے۔ کبھی اس طرح بھی زبانیں بنتی ہیں اور پھیلی ہیں۔ قدرتی طور پر بنتی اور قدرتی اسباب سے بڑھتی ہیں۔ مگر آفرین ہے اس کے بانی اور اس کے ہمراہیوں کی ہمت اور تدبیر پر۔ انہوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ اور اب یورپ کے ہر بڑے شہر میں "اسپرانٹو" والوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی ہے۔ اور برلن ۔ پیرس اور لندن کی بڑی بڑی دوکانوں پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہاں "اسپرانٹو" بولی جاتی ہے۔ اس کے بانیوں کا یہ منشا نہیں کہ یہ موجودہ زبانوں کی جگہ چھین لے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ہر قوم اپنے گھر میں اپنی زبان اور اپنے علم ادب کو ہی ترجیح دیگی۔ اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر اس مشترکہ زبان کو اختیار کرنے گی بے سود ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ یہ مشترکہ زبان اُن سب مختلف زبانوں والی قوموں میں ایک مفید واسطہ بن جائے اور خصوصاً تجارتی کاروبار میں سہولت کا باعث ہو۔ تاکہ "اسپرانٹو" جاننے والا یورپ کے ہر حصے میں اپنا کام نکال لے۔ علمِ لسان کے چند علما کے علاوہ پہلے جس طبقے نے اس زبان کی طرف توجہ کی وہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ کیونکہ انہیں اس کے اختیار کرنے اور اس کی اشاعت کرنے میں صریح فائدہ نظر آیا۔ اس کے بعد اُن کی مثال کے اثر اور اُن کی شبانہ روز سعی کی بدولت اور لوگ بھی ماننے لگے۔ کہ اس زبان کو پھیلانا چاہیئے اب اُن لوگوں کو یہاں تک کامیابی ہو گئی ہے کہ لندن اور پیرس کے اکثر

مدارس میں یہ زبان داخلِ درس ہو گئی ہے۔ اور اُن لڑکوں کو جو تجارتی کاروبار میں پڑنا چاہتے ہیں۔ تاکید ہے کہ وہ یہ زبان ضرور سیکھیں۔ علاوہ ازیں اس کے حامی ہر برس ایک عظیم الشان کانفرنس یورپ کے کسی نہ کسی مشہور مقام میں کرتے ہیں اور وہاں ہر مُلک کے رہنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اُس جلسے کی کارروائی سب اسی زبان میں ہوتی ہے اور اراکین ایک دوسرے سے "اسپرانٹو" میں باتیں کرتے۔ میں جب شمالی فرانس میں بولون میں مقیم تھا۔ تو مجھے اِن کا سالانہ مجمع دیکھنے کا اتفاق ہُوا تھا۔ اس برس کیمبرج میں "اسپرانٹو" والوں کا جلسۂ سالانہ ہُوا ہے۔ اور کیمبرج جیسے علمی مرکز کی طرف سے اس جلسے کی اجازت اور تائید گویا اِس زبان کے لئے انگلستان کی طرف سے فرمانِ منظوری اور اس کی کامیابی کے لئے ایک نیک فال ہے۔ اب اگر اس کے حامی اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے جو آج تک اُن کا شعار رہی ہے تو وہ ضرور کامیاب ہونگے اور اُسے آخر یورپ کی زبانِ عمومی بنا کے چھوڑینگے۔

"اسپرانٹو" والوں نے کئی وسائل اس زبان کے مقبول بنانے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ جا بجا "اسپرانٹو" انجمنیں قائم کی ہیں۔ اُن کی انجمنوں کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان میں "اسپرانٹو" کی مشق ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے مختلف اللسان لوگ آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ سارے یورپ کی زبانوں کی مشہور اور مقبول ترین کتابوں کا اس زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ لطیف سے لطیف خیالات بھی اس میں ادا ہو سکتے ہیں۔ ہر دلعزیز گیتوں کا ترجمہ بھی اسپرانٹو میں کیا گیا ہے اور موسیقی کے بعض اُستادانِ فن اپنی دلکش آواز سے ان گیتوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ کئی رسالے "اسپرانٹو" میں نکلنے لگے ہیں۔ اور "اسپرانٹو" کے ہواخواہ بعض اخبارات میں اپنے تجارتی اشتہارات اس زبان میں چھپواتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی نگاہیں اس کے الفاظ سے آشنا ہو جائیں۔ اور بیگانگی دُور ہو جائے۔ اسپرانٹو کے معاونوں کی سرگرمی کا یہ حال ہے۔ کہ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ جہاں کسی نئے شخص سے مُلاقات ہوئی۔ پہلا سوال یہ کرتے ہیں "آپ "اسپرانٹو" جانتے ہیں۔ اگر اُسنے "اسپرانٹو" کا نام سُنا ہے تو اُس کے متعلق باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور اگر نہیں سُنا تو مختصر سا حال اِس کے

آغاز اور رائس کی ترقی کا سُنا کر اُسے اس کی طرف توجہ کرنے کا شوق دلاتے ہیں۔ "اسپرانٹو" پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے ہیں وہ ان لوگوں کے پاس اکثر موجود رہتے ہیں۔ اور نئے شائقین میں بانٹے جاتے ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اُن کوششوں کا جو یورپ کی مختلف اللسان قوموں میں رابطۂ اتحاد اور سہولتِ تجارت پیدا کرنے کے لئے ہو رہی ہیں۔ اور باوجودیکہ ایک نئی زبان کا عدم سے وجود میں لانا ایک کٹھن کام ہے۔ "اسپرانٹو" کے حامی کمر ہمت باندھے ہوئے مصروفِ سعی ہیں۔ اور کامیابی کے اُمیدوار۔ یہانتک کہ انہوں نے اس نئی زبان کا نام ہی "زبانِ اُمید" رکھا ہے۔ اس خاکِ پاک ہند میں بھی جو ہمارا وطن ہے ایک زبانِ اُمید موجود ہے۔ جو یورپ کی "اسپرانٹو" سے بہت سی باتوں میں ملتی اور بعض اعتبارات سے فضیلت رکھتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے غافل ہیں۔ اور اُن امکانات سے بیخبر ہیں جو اس کی ترقی میں پنہاں ہیں۔

ہماری "اسپرانٹو" وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اردو۔ کوئی ہندی اور کوئی ہندوستانی زبان کہتا ہے۔ ہم نام کے پابند نہیں۔ ہمیں کام سے کام ہے۔ جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو۔ اس نام سے اُسے یاد کرے مگر اس کوشش میں رہے۔ کہ چار دانگ عالم میں ہندوستان کی اس خُداداد اسپرانٹو، کا چرچا ہو جائے۔ اُردو کو میں "خداداد اسپرانٹو" اس لئے کہتا ہوں۔ کہ اپنی یورپین بہن کی طرح یہ ایک تازہ انسانی ایجاد نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں میں اُن قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ جن سے دُنیا بھر کی زبانیں پیدا ہوئی اور بڑھی ہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ جو ہماری اسپرانٹو" کو یورپ کی اسپرانٹو پر حاصل ہے۔ اسی لئے اُردو کے پھیلانے کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ اسپرانٹو بولنے والوں کا وجود ہی نہ تھا اور ہندوستانی بولنے والے ہمارے ملک میں صدیوں سے چلے آتے ہیں۔ یورپ میں "اسپرانٹو" کا فقط اس کی ذاتی کامیابی کی توقع کے سبب "اُمید" نام رکھا گیا ہے۔ مگر ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی کامیابی مُلک کی کامیابی ہے اور مُلک کی بہتری اور اہل ملک کے اتحاد کی اُمید کا صرف یہی ایک حیلہ ہے۔ کہ کم از کم سب ہم زبان تو ہوں۔ اختلافات مذہبی تو کسی کے مٹائے مٹنے والے

نہیں۔ مگر ایک مُلک میں ایک حکومت کے زیر سایۂ رہتے ہوئے اور نقل و حرکت کے ذرائع کی کثرت کے باوجود ملکی زبان کا ایک نہ ہو سکنا اور اس کی اشاعت میں کوتاہیاں نہایت قابلِ افسوس ہیں۔

کئی زبانوں کا مجموعہ مرکب ہونے میں اردو کو اسپرانٹو کے ساتھ پوری مشابہت ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی اور الفاظ کی آمیزش کی گنجائش اس میں موجود ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کی موجودہ بولیاں جو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے کے قابل اور قائم رہنے والی ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ اور خصوصاً ہندوستانی کے الفاظ اُن میں بہت سے شامل ہیں۔ جو انگریزی الفاظ اب ہندوستان کی زبانوں میں مل کر جزوِ زبان بن گئے ہیں۔ اُن سے یہ مشترک حصہ ان سب زبانوں کا اور بھی زیادہ ہو گیا ہے ایسی صورت میں اردو کا عام رواج پا جانا سب کی آسانی کا باعث ہے اور بغیر بہت غیر معمولی تردد کے ممکن ہے۔ اگر لوگ اس طرف مائل ہوں۔ یورپ جس کے لئے ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہ بارہ مختلف دُوَل کا مجموعہ ہے۔ جہاں ہر حکومت میں زبان جدا۔ طرزِ حکومت جدا۔ اور قانون جدا ہے۔ ایک حکومت کے باشندوں کی اغراض اکثر اوقات دوسری حکومت کے باشندوں کی اغراض کے خلاف ہیں۔ اور ایک سلطنت اور دوسری سلطنت میں رقابت موجود ہے۔ مگر اُن لوگوں کی وسعتِ خیال اور روشن دماغی دیکھئے کہ ایسے بڑے اختلافات کو بھی مٹانے یا اُن کے دبانے کے لئے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر میں ہیں اور ہماری کوتاہ اندیشی کو دیکھئے کہ ایک مُلک۔ ایک حکومت اور مشترک ضروریات اور اغراض کے باوجود فکرِ ہم زبانی سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہمارے راستے میں وہ مشکلات بھی نہیں جو اُن کے راستے میں ہیں۔ کیسا عمدہ موقعہ ہے جو ہم کھو رہے ہیں ؎

اے دل بہ کوئے دوست گذارے نہ کردۂ ‌ ‌ ‌ ‌ فرصت زدست دادہ وکارے نہ کردۂ
میدان فراخ دیدہ و گوئے نہ بردۂ ‌ ‌ ‌ ‌ شاہیں بہ دست و عزمِ شکارے نہ کردۂ

میرے خیال میں اب وہ وقت نہیں رہا۔ کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ کہ ہماری زبان میں اگر قوتِ نمو ہے تو خود بخود بڑھے گی۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں ترقی

کی طاقت موجود ہے اور ہماری کوشش کے بغیر یا بے دلی کی کوشش سے بھی کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے۔ اُس کا ذخیرۂ ادب بھی روز افزوں ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی رہتی ہے اور مُلک کے دُور دراز گوشوں میں بلکہ دُنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی اس کی آواز پہنچنے لگی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے کافی نہیں ہے۔ اس ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہوسکتی ہے۔ اگر ہم اس کی خاطر کچھ تکلیف گوارا کرنے لگیں۔

ہمیں اپنے سب بڑے بڑے شہروں میں اپنی زبان اُمید کی انجمنیں قائم کرنی چاہئیں۔ جن میں اس کے شائقین۔ اس کے دلدادہ۔ اس کے ہواخواہ۔ بلاقیدِ ملّت و مذہب جمع ہوں۔ اور اپنی اپنی محنت کے نتائج سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اس کے علمی اور ادبی ذخیروں کو بڑھائیں۔ ہمعصروں سے داد پائیں اور آیندہ نسلوں کو ممنونِ منت کریں۔ وقتاً فوقتاً کوئی کانفرنس یا بڑا جلسہ بھی ہونا چاہئے۔ جس میں مُلک کے ہر گوشہ سے اس زبان کے مصنف۔ مؤلف۔ مترجم۔ اخبار نویس سب جمع ہوں۔ یہ پہلا کام ہوگا جس میں نامور اہل قلم بلا لحاظ مذہب ایک مشترک مقصد کے لئے جمع ہوں گے۔

اُن صوبجاتِ ہند میں جہاں اُردو مادری زبان نہیں ایک اور طریقِ عمل بہت مفید ہوسکتا ہے۔ مَیں نے انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسی زبان کے طالب علم فرانسیسی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے۔ اور فرانس میں انگریزی پڑھنے والے انگریزی کے لئے یہ تدبیر استعمال کرتے ہیں کہ کئی آدمی یکجا جمع ہو کر مشہور کتابوں کے انتخاب پڑھتے ہیں اور لوگ سُننے آتے ہیں۔ اس سے تلفظ بہ سہولت کرنے کی عادت ہوتی ہے اور روزمرّہ درست ہو جاتا ہے۔ فرانس میں تو مَیں نے فرانسیسی لوگوں کو اپنی زبان کی مشق کے لئے اسی طریق سے فائدہ اُٹھاتے دیکھا ہے۔ جن صوبجاتِ ہند میں اُردو کا رواج نسبتاً کم ہے مثلاً بنگال، مدراس اور بمبئی۔ وہاں اس قسم کی اُردو انجمنوں کی ضرورت ہے۔ ایسی ہی مجالس "اسپرانٹو" کے حامیوں نے یورپ میں قائم کی ہیں۔ اِن انجمنوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو بے تکلف اُردو بول سکتے ہیں اور وہ اپنے گرد جمع کریں ایسے لوگوں کو جو اُردو کے فوائد، تمدنی۔ تجارتی اور سیاسی کو مدنظر رکھکر اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔ جلسے کی کارروائی اُردو میں ہو۔ ضابطہ کی کارروائی کے علاوہ میل ملاپ اور

بات چیت کے موقعے پیدا کئے جائیں۔ تاکہ سب اراکین کو تکلّم کی مشق ہو۔ اور جلسے کی دلچسپی بڑھانے کے لیئے اُردو نظم و نثر کی مقبول کتابوں کے انتخابات وہاں پڑھے جائیں اور اُردو کے مشہور گیت بھی کبھی کبھی گائے جائیں۔ پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے۔ ہمارے ملک میں بھی مروج رہا ہے اور اب ایک دوسرے رنگ میں یورپ میں مروج ہے۔ اچھا پڑھنے والا عمدہ کلام میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے اور وہی انتخاب جو کتاب میں چھپا ہوا صرف چند اہل نظر کو گرویدہ کرتا۔ ہوشیار پڑھنے والے کی زبان اور فن کی تاثیر سے خاص و عام کو قائل کر لیتا ہے۔ ایسے مشاق پڑھنے والے آجکل ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔ ان کی تعداد کو بڑھانا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ایک مفید ذریعہ ترقی زبان کا ہے۔ اور اگر ہم اُن سب ذرائع سے جو اس ہر دلعزیز زبان کی اشاعت کے ہمارے پاس موجود ہیں۔ کام لیں۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہماری "اُسپرانٹو" ایک نصف صدی میں ہندوستان بھر کی زبان عمومی نہ بن جائے۔ اگر "اسپرانٹو" کے چند مددگار چند سال میں کئی سو سے کئی ہزار اور کئی ہزار سے کئی لاکھ بن سکتے ہیں۔ تو کیا ہماری "اُسپرانٹو" کے کئی کروڑ بولنے والے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ ہمت کریں تو منزل بہت دُور نہیں اور ہمت ہار بیٹھیں تو اس سے دشوار تر منزل کوئی ہو نہیں سکتی ؂

عبد القادر

فلسفۂ جمال

انسان، حیوان، شجر، حجر، یہ نیلگوں آسمان، یہ چمکتے ہوئے ستارے، اور تمام ہمارے گردوپیش کی اشیاء میں سے کونسی ایسی چیز ہے جو حسین اور جمیل نہیں ہے اور وہ کونسی ایسی چیز ہے جس کو ہم خوبصورتی سے نہیں متصف کرتے ہماری طبیعت جو اس حسن حقیقی کا ایک پرتو ہے اور جو ازل سے حسن بینی اور حسن شناسی کا مذاق لیکر اس عالم کی سیر کو آئی ہے جس کی پرورش و پرداخت محض حسن کے ہاتھوں ہوتی ہے اور جس کو خدائے حسن یا فلسفۂ جمال کے موضوع حقیقی نے خود اپنے دست خاص سے بنایا ہے ہر شئے کو جمیل و حسین دیکھنا چاہتی ہے ؂

جب ہم اس جمیل لذاتہ کے صنایع و بدایع پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ہر جگہ حسن و جمال کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال کے اصول کو پیش نظر رکھکر ہمارے روحانی مقتداؤں نے معرفتِ باری کا طریقہ محض عجائبات عالم اور اس کے صنائع بدائع پر نظر رکھنا تعلیم کیا ہے۔ اور ہمارے مادی مقتدا جس قدر عالم کی چھان بین کرتے ہیں اور اس کے اجزاء کی تحقیق کرتے ہیں اسی قدر ان کو حسن و جمال کے زیادہ جلوے نظر آتے ہیں +

حُسن کی پرستش دنیا میں لوگوں نے بہت کی ہے۔ کسی نے اسکو رب النوع قرار دیا ہے اور کسی نے اس کو دیوی دیوتا مانا ہے اور کوئی اس کو "گاڈز" کہتا ہے مگر حیرت یہ ہے وہ یہ ہے کہ گو اس لفظ مشترک کا استعمال دُنیا بھر کے لئے کیا جاتا ہے اور اس کا عمل مختلف الاقسام والماہیت اشیاء پر ہوتا ہے تاہم اس کی تعریف حقیقی ایک مدت تک نہ ہو سکی +

ابتدا سے لیکر اس وقت تک حکماء فلاسفر نے اس مسئلہ پر بہت کچھ غور و فکر کیا مگر ان کی عقلیں حُسن کی حد سے باہر اور اس کی تشریح سے قاصر رہیں چنانچہ حسن کی منطقی جامع و مانع تعریف اس وقت تک کوئی موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ اعتراضات سے خالی نہیں یا تو اس میں اس قدر تعمیم ہے کہ ان میں حسن کے علاوہ اور دوسری چیزیں آکر شریک شامل ہو جاتی ہیں اور یا اس قدر تخصیص ہے کہ اس کو پہنانے کی شے خود حسن کی قطع و برید کرنے کی نوبت آتی۔ اور ایسا ہونا بالکل اصول عقلی کے مطابق اور موافق ہے کیونکہ اگر حسن اضافی کی تعریف کرنا مد نظر ہے (جس سے میری مراد کوئی خاص صفت یا نوع حسن ہے) تو یہ کسی قدر آسان تھا۔ مثلاً عورت مرد۔ گھوڑے، شیر، کبوتر کے حسن کی تعریف علیحدہ علیحدہ کرنا آسان ہے مگر جب ہم لفظ حسن پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہیں اور اس حسن کلی کی تعریف کرنا چاہتے ہیں اور کلی حیثیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم اس عظیم الشان سمندر کے آگے کھڑے ہو کر صرف اپنے خطوط نظر کی استقامت تو دیکھتے ہیں لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ہمارا نظر خط نے انکسار کے بعد اس خط عمودی سے آگے کیا ہے +

خصوصاً اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس محمول کے موضوع جسقدر ہیں سب کی تاثیر نفس پر ایک ہوتی ہے اور اگر اختلاف ہوتا بھی ہے تو وہ محض کم ہماری حیرت اور زیادہ

بڑھ جاتی ہے لیکن ہم ان سب حیرتوں اور کسل عقلی کو نظر انداز کر کے اپنی عقل رسا کے گھوڑے کو تازہ دم کر کے پھر میدان غور میں گرم سیر کرتے ہیں تو ہم کو اپنی منزل مقصود کی روشنی دور سے دکھائی دیتی ہے اور ہم کو رفتہ رفتہ آثار منزل نظر آنے لگتے ہیں اور ہم اپنی منزل تک پہنچ جانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اور یہی ان تھک محنت کا نتیجہ ہم کو مل جاتا ہے۔

حکماء اور فلسفیوں کا حسن و جمال کے متعلق نہایت سخت اختلاف ہے اور یہ اختلاف آرا کثرت آرا کا باعث ہو گیا ہے لیکن تاہم اگر ہم اسراف میں اقتصاد کو کام میں لائیں اور تعدد کو وحدانیت یا اس سے قریب کرنا چاہیں تو یہ سب مذاہب مختلفہ کے مذہبوں کی تحت میں آجاتی ہیں ان میں سے ایک تو وہ ہے جو جمال کو محض ذات مدرک (دیکھنے والے) تک محدود رکھتا ہے اور ان اشیاء سے جو خارجی ہیں یا قوت ادراکیہ کا معقول ہیں اس خوبی کو سلب کر لیتا ہے۔ دوسرا مذہب یا وہ ہے جو یہ مانتا ہے کہ نہیں جمال وحسن کا قیام ذات مدرک میں نہیں ہے بلکہ کسی کا حسین وجمیل ہونا خود اسی شے میں قابل اعتبار ہے اور اشیا خارجی ہی خود حسین ہوتی ہیں اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ پہلے مذہب والے یہ کہتے ہیں کہ جمال نہ تو ان اشیاء میں ہے جن کو ہم دیکھتے ہیں اور نہ ان باتوں میں جن کو ہم سنتے ہیں بلکہ یہ صفت خود ہماری ذات میں ہے اور ہم جس چیز کی طرف چاہتے ہیں اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ دوسرے مذہب کے پیرو یہ بیان کرتے ہیں کہ نہیں جمال ایک خارجی شے ہے انتزاع ذہنی نہیں بلکہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں اور جن باتوں کو ہم سنتے ہیں ان میں جمال خود موجود ہے۔

پہلے مذہب کے ماننے والے تین اسکول ہیں جن میں اس امر پر تو اتفاق ہے کہ حسن مدرک میں ایک شے ہے بلکہ اس کی ماہیت وحقیقت میں اختلاف ہے پہلا اسکول تو یہ کہتا ہے کہ جمال ایک لذیذ انفصال نفسانی کا نام ہے جس کو ہر شخص اسوقت محسوس کرتا ہے جبکہ اس کے سامنے اس انفصال کو ہیجان میں لانے والی کوئی چیز آجاتی ہے اس مذہب کو مثال میں یوں سمجھو کہ ان لوگوں کے نزدیک جمال کی حالت بالکل رنگ یا مزہ کی ہے، ذائقہ کی کئی قسمیں ہیں۔ ترش، میٹھا، پھیکا۔ یہ مزے خود چیزوں میں علیحدہ مستقلاً موجود نہیں ہیں بلکہ مثلاً جب کوئی امرتی کھاتا ہے تو اس سے زبان کے اعصاب

متاثر ہوتے ہیں اور یہ تاثیر دماغ کی طرف رجوع کرتی ہے اسی تاثیر کا نتیجہ ہے کہ مزہ شیریں محسوس ہوتا ہے اور جب یہ شعور و احساس نفس کو حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس کو امرتی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ پس یہ معلوم ہوا کہ شیرینی اس قوت کا نام نہیں ہے جو قوت ذائقہ کو متاثر کرتی ہے بلکہ اس احساس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح رنگ کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ وہ اس روشنی کا نتیجہ ہے جو ان اجسام ذی اللون سے منعکس ہوتی ہے بعینہ یہی حال جمال کا بھی ہے جب ہم کسی شے کو حسین یا خوبصورت کہتے ہیں تو اس شے میں خود کوئی جمال نہیں ہوتا بلکہ نفس کو لذت آمیز انفصال اس کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے اسی کا نام ہے جمال پھر ہم اس جمال کو اس شے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جیسا کہ ابھی ہم لکھ آئے ہیں کہ شیرینی ایک خاص قسم کے احساس کا نام ہے جس کو ہم شے خارجی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں لہذا جمال وہ قوت نہیں ہے جو یہ انفصال پیدا کرتی ہے بلکہ خود اس انفصال کو جمال کہتے ہیں اسی وجہ سے جمال کا تعلق مدرک سے ہوگا نہ (شے خارجی) سے۔

دوسرا اسکول اسی گروہ کا یہ کہتا ہے کہ جمال نام ہے چند انسانی خیالات کے مجموعہ کا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نفس انسانی بعض چیزوں کے دیکھنے اور سننے سے خوش ہوتا ہے اور جب وہ ان دیکھی یا سنی ہوئی چیزوں کا اعادہ کرتا ہے تو یہی پہلا انفصال پھر عود کرتا ہے یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کو پیشتر دیکھا تھا اور ان سے طبیعت منفصل ہوئی تھی اور اس کے بعد ایسی چیزوں کو دیکھا کہ ان میں اور پہلی چیزوں میں مخالفت یا مشابہت ہے تو یہ مخالفت یا مشابہت پہلی چیزوں کو یاد دلاتی ہے اور وہ پہلی چیز ایک انفصال لذیذ پیدا کرتی ہے ؎

مثلاً ایک شخص نے ایک پارک دیکھا جس میں سبزہ لہلہا رہا ہے۔ جا بجا کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی ہیں اور نفیس نفیس چھوٹے چھوٹے پودے ایک مناسب بعد پر ایک ترتیب سے قائم ہیں اور کہیں کہیں دور دور پر سایہ دار درخت جھوم رہے ہیں۔ فوارہ اپنی پھوار چھوڑ کر نیا منظر پیش کر رہا ہے تو یہ سنیری یا نظارہ مختلف دوسری صورتیں اور دوسرے انفصالات پیدا کریگا جن سے اور زیادہ مسرت انگیز انفصال پیدا ہوں گے۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ دل و دماغ ان انفصالات جمال سے پر ہو جائیگا۔ پس جمال اس فرقہ کے نزدیک مدرک کے ایتلاف افکار اور اس کے انفصالات کی ترکیب کا نام ہے۔ جو مدرک میں پایا جاتا ہے نہ شے خارجی میں۔

اسی گروہ کا ایک تیسرا اسکول جمال کے متعلق یہ "تصویری" قائم کرتا ہے کہ جمال نام ہے دل خوش کن اوصاف کا مثلاً اگر کسی خط کو دیکھو کہ وہ منحنی کھینچا گیا ہے اور اس کی رفتار بالکل دریا کی موج بنائی گئی ہے تو وہ خط مجکو خوبصورت معلوم ہوگا۔ وہ خط اس وجہ سے خوبصورت نہیں ہے کہ اس میں جمال وحسن پایا جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے وہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں ہنرمندی اور لطافت پائی جاتی ہے جو اسی کی صفات عقلیہ میں سے ہیں جن سے نفس انسانی خوش ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس خط میں جمال وحسن پایا جاتا ہے لہذا جمال کوئی خارجی شے نہیں ہوئی بلکہ خود ذات مدرک میں ہے۔

گو ان میں سے ہر ایک اسکول کے دلائل نہایت کمزور ہیں اور فرداً فرداً ہر ایک پر تنقید کرنا مشکل امر نہیں ہے لیکن ہم اسی مسئلہ پر نظر کرتے ہیں کہ حسن وجمال ذات مدرک میں پایا جاتا ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ حسن وجمال کا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ جب مدرک کے وجود کا انتشعار ہو جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے حسن کے وجود کا انتشعار بھی ہو جائے اگر کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو تو کوئی شے جمیل نہ ہو مثلاً موتی جب دریا میں سیپی کے اندر ہو تو وہ اس بناء پر خوبصورت اور قابل قدر شے نہ ہوگا کہ اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے یہ ایک نہایت مہمل بات ہے۔ جس کو عقل سلیم جائز نہیں رکھتی۔

اب ہم اس گروہ کے مذاہب کی تحقیق کرتے ہیں کہ حسن شے خارجی میں پایا جاتا ہے اسکا انحصار ذات مدرک تک نہیں اس گروہ کے بھی کئی اسکول ہیں ایک تو یہ کہتا ہے کہ جمال نام ہے جدت وغرابت کا جو اس مشہور مقولہ کے موافق ہے کل جدید لہ بھجۃ۔ لیکن یہ مذہب بالکل غلط ہے اور اس پر صاف طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے کیونکہ یہ ضرورت نہیں ہے کہ ہر جدید و غریب شے حسین و جمیل ہی ہو مثلاً جب کوئی پہلے پہل اونٹ کو دیکھتا ہے باوجودیکہ وہ نئی چیز ہوتی

ہے گو اُسے دیکھ کر استعجاب ہوتا ہے تاہم اس کے بد نوار ہونے کا خیال فوراً ہی ذہن میں آجاتا ہے۔ اور اس کی صورت مکروہ نظر آتی ہے۔

ایک دوسرا اسکول یہ مانتا ہے کہ ہر جمیل و حسین شے مفید و نافع ہوتی ہے لہذا جمال نام ہے نفع اور فائدہ کا لیکن یہ مذہب بھی میری رائے میں مخدوش ہے کیونکہ اس کا عکس یہ ہوگا بعض مفید اشیا جمیل ہوتی ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض مفید ایسی چیزیں ہیں جو جمیل ہیں نفع اور جمال میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ مثلاً گدھے کو دیکھو کہ کس قدر بد صورت ہے مگر پھر اسی کے ساتھ نہایت مفید ہے۔ اسی کے ساتھ مور پر نظر ڈالو دیکھو کس قدر خوبصورت ہے مگر گدھے کے مقابلہ میں کچھ بھی مفید نہیں ہے

ایک اور سکول یہ خیال کرتا ہے کہ جمال نام ہے وحدۃ تعدد کا اس وجہ سے کہ عقل انسانی کا یہ مقتضیٰ ہے کہ اشیا کے مختلف اجزاء کو مجتمع اور وحدانیت کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ مختلف نغمے ایک سُر یا لحن کی صورت میں جب جمع کر دیئے جاتے ہیں تو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ رنگ رنگی چیز نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر تعدد کو وحدت کی صورت میں نہ جمع کریں تو یہ خوبی و جمال مفقود ہو جائے۔ اگر کسی لحن میں صرف ایک ہی نغمہ ہو تو اس کا بار بار اعادہ ناگوار خاطر ہوتا ہے مگر یہ بات بالکل غلط ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض ایک رنگ ہی کی چیزیں عمدہ ہوتی ہیں۔ مثلاً آفتاب کے غروب کے بعد جو آسمان کا رنگ ہوتا ہے وہ نہایت درجہ بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں وحدت تعدد نہیں ہے حالانکہ اس کے حسین اور خوبصورت ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔

ایک اسکول اسی گروہ کا یہ بھی مانتا ہے کہ جمال نام ہے ترتیب اور تناسب کا۔ ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ شے مرکب کے اجزاء اس ترتیب سے ہوں کہ جس مقصود کے لئے وہ لائے گئے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً آنکھ آگے کے رُخ کے لئے نہایت موزوں ہے اگر گردن کی طرف ہوتی تو یہ اپنا مقصد نہ پورا کر سکتی، لہذا ترتیب نہ پائی جاتی جس کا نام جمال ہے تناسب سے یہ مقصود ہے کہ کسی شے کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ مناسبت ہو خواہ زمانی ہو خواہ مکانی اس طرح پر کہ ان کے وجود کا جو مقصود ہے وہ پورا ہوتا ہو مثلاً

پیروں کا تناسب اس کے جسامت اور جثہ کے لحاظ سے اگر اسی کے ہاتھ پاؤں کے بجائے کتے کے ہاتھ پاؤں اس کو دیئے جاتے تو وہ اس بوجھ کو نہ اٹھا سکتے اور تناسب نہ ہوتا جس کا نام جمال ہے۔ یہ مذہب سب مذاہب میں زیادہ مضبوط اور عمدہ ہے گو اس پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ بعض قبیح چیزوں میں بھی تناسب پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قبیح اس وجہ سے ہے کہ آپس میں پورا پورا تناسب نہیں پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی قطع کی چیز ایک قوم پسند کرتی ہے اور دوسری قوم اس سے نفرت کرتی ہے اس کا کیا سبب ہے اگر وہ حسین ہے تو ہر حالت میں حسین رہنا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا انحصار اختلاف مذاق پر ہے۔

ضیاء الحسن علوی

تولہ بھر ریڈیم

کچھ دن ہوئے لندن کے چند بیفکروں نے ایک جگہ جمع ہو کر یہ سوچنا شروع کیا کہ تفریح و دلچسپی کا ایسا کونسا مشغلہ ہو سکتا ہے کہ وقت بھی بڑے مزے میں گذرے اور گرہ سے بھی کچھ خرچ نہ ہو۔ یہ لوگ انگریزی سوسائٹی کا خلاصہ اور انگلستان کی شرافت کا عطر تھے۔ ان میں سے کوئی ڈیوک تھا۔ کوئی بیرن کوئی پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور کوئی فوجی افسر۔ سب کے سب مجرد تھے اور اس آزادی کے صدقے ہیں جس کے لحاظ سے انگلستان کے مرد و عورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ سبھی طرح کے گلچھرے اُڑا چکے تھے کوئی ایسی ہوس نہ تھی جو انھوں نے پوری نہ کی ہو اور کوئی ایسا پاپڑ نہ تھا جو اُنھوں نے نہ بیلا ہو۔ زندگی کا لطف خاص طور پر حاصل کرنے کے لئے اب اُنھیں کسی ایسے مشغلہ کی ضرورت تھی جو بڑا ہی انوکھا ہو۔

سوچتے سوچتے آخر ایک کی طبیعت لڑ گئی اور اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم لوگ ایک انجمن نقب زنی قائم کریں جس کی رکنیت کی فیس یہ ہو کہ ہر رکن سال میں ایک دفعہ لندن کا

کوئی گھر جسے صدر انجمن صاحب تجویز کریں بھوڑا کرے اس تجویز پر سب نے بہ اشتیاق تمام صاد کیا اور ایک باقاعدہ انجمن نقب زنی قائم ہوگئی جس کے ارکان کی تعداد ایک رکن کی تحریک کی بنا پر الف لیلہ کے مشہور علی بابا اور چالیس چوروں والے قصہ کی مناسبت سے چالیس تھی۔

ایک دن جب بعض ضروری امور پر غور کرنے کے لئے اس انجمن کا باقاعدہ اجلاس ہُوا تو صدر انجمن نے پہلے تو بلا کسی تمہید کے حاضرین سے یہ کہا کہ ریڈیم جیسی نایاب چیز بہ مقدار کثیر موجود ہو گئی اور اُس کے بعد جیب میں سے ایک اخبار نکال کر حسب ذیل عبارت پڑھنی شروع کی :۔

"کچھ عرصہ ہوا کہ آدھ سیر ریڈیم کی قیمت آٹھ لاکھ چھیانوے ہزار پاؤنڈ (ایک کروڑ چوبیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ) بتائی گئی تھی۔ جن جن لوگوں کے پاس اس نادر الوجود عنصر کی کوئی مقدار بہ غرض فروخت موجود ہو اُنہیں ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اسے علیحدہ کر ڈالیں کیونکہ پروفیسر بلیتھ نے اس عنصر کے بہ مقدار کثیر بہم پہنچانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ کے مطابق پروفیسر موصوف نے تولہ بھر ریڈیم جسکی قیمت بازار کے بھاؤ سے تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپے ہوتی ہے تیار کر لی ہے اور چند خاص خاص ماہرین علم کیمیا نے پروفیسر بلیتھ کے کارخانہ میں جا کر اس کی اصلیت کے متعلق اپنی تشفی کر لی ہے۔

مُعلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنیوالا ہے جب ریڈیم نظری دُنیا سے عملی دنیا میں آجائیگی اور اس کا شمار تمدن کی بڑی قوتوں میں ہونے لگے گا۔ چونکہ اس عجیب و غریب عنصر کے چھوٹے سے ٹکڑے میں یہ تاثیر موجود ہے کہ ایک متوسط الحال شخص کے آتش دان کو دو ہزار سال تک کوئلہ کی احتیاج سے مستغنی رکھ سکے لہذا ظاہر ہے شہروں میں دھوئیں کی وجہ سے آجکل جو تکلیف ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہیگی۔ دخانی جہازوں کو کوئلہ کی کانوں کے بیکار ہوجانے کی وجہ سے کوئی دس لاکھ مزدوروں کو معاش کی کوئی دوسری شکل نکالنی پڑے گی"۔

ایک رکن "ہو گا تو بڑے مزے کا زمانہ"۔

دوسرا رکن "لیکن اسے ہماری آج کی کارروائی سے کیا تعلق"؟

صدرِ انجمن "مجھے بات پوری تو کر لینے دی ہوتی اس کے بعد ٹوکا ہوتا"

دوسرا رکن "ارشاد ہو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں"

صدرِ انجمن "ہمارے سکرٹری صاحب نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر جیرلڈ براؤن کا چندہ بابت سال گذشتہ ابھی تک وصول نہیں ہُوا۔ لہٰذا مَیں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میجر براؤن یہ تولہ بھر ریڈیم مالیتی تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ پروفیسر بلیتھ کے مکان سے لا کر انجمن کے اجلاس آیندہ میں پیش کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس معزز انجمن کی رکنیت کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ جیسی ہیچ میرزرقم اس کے برقرار رکھنے کا کافی معاوضہ ہو سکے"

اس فیصلہ کی تعمیل کے خیال سے گذشتہ ماہ اپریل کی پہلی تاریخ کو آدھی رات کے وقت میجر جیرلڈ بروان پروفیسر بلیتھ کے مکان واقع لڈگیٹ سرکس کے پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ میجر صاحب کا طرزِ عمل وہی تھا جو ایک معمولی چور کا ہوتا ہے۔ آپ کھڑکی توڑ کر ایک کمرہ میں گھسے یہ کمرہ پروفیسر کا معمل یا دارالتجربہ تھا چونکہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا لہٰذا میجر براؤن نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی برقی لالٹین نکال کر روشنی کی اور ہر طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا جو صرف ایک چٹخنی کھول کر وہ آگے بڑھا کچھ دُور جا کر دہنے ہاتھ کی طرف ایک دروازہ اور دیکھا جس کے پٹ بالکل کھلے تھے۔ دروازہ میں سے اُسے جو کچھ نظر آیا وہ اسے محوِ حیرت و استعجاب کرنے کے لئے کافی تھا۔ کمرہ کے وسط میں میز پر ایک چمکدار چیز رکھی ہوئی تھی۔ مقابل والی دیوار پر کوئی ایک فٹ مربع جگہ اس چمکدار چیز کے عکس کی وجہ سے نورانی ہو رہی تھی۔ یہ ریڈیم تھا۔ میجر کو تعجب ہوا کہ پروفیسر نے ایسی بیش بہا چیز کو کیوں اس طرح سے کھلا چھوڑ دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ پروفیسر نے سائنس دانوں کے دکھانے کے لئے اسے یہاں رکھا تھا۔ لیکن تین لاکھ چونسٹھ ہزار کا مال کھُلے کمرہ میں میز پر رکھ دینا ایسی لغویت تھی جس کا ارتکاب پروفیسر کے سوا کوئی دوسرا کرتا تو اوّل درجہ کا پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن یہ ایسا وقت تھا کہ میجر بروان پروفیسر کے

قوائے ذہنی کی صحت و عدم صحت پر کھڑا ہوا غور کیا کرتا چنانچہ وہ میز کی طرف بڑھا۔ لیکن دہلیز کے اندر قدم رکھا کہ دروازے کے پٹ بڑے زور سے بند ہوئے۔ میجر حیران ہوا کہ دروازہ کیسے بند ہُوا کیونکہ نہ ہوا تھی نہ کوئی شخص موجود تھا جس نے دروازہ بند کیا ہو۔ کچھ دیر تک محو حیرت رہنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف بڑھا کہ پٹ پھر کھولدے اور گھنڈی گھما کر کھینچا لیکن معلوم ہُوا کہ دروازہ مقفل ہے اُس نے گھنڈی کو ہر طرف گھمانا دبانا شروع کیا مگر بے سود۔ چٹخنیوں کو ٹٹولا کہ بند ہونے کے دھماکے سے پیچھے والی چٹخنی تو کہیں گر نہ گئی ہو لیکن چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے دروازہ کو پھر اچھی طرح سے دیکھنا شروع کیا۔ سوا اُس گھنڈی کے جسے وہ ہر طرف گھما چکا تھا اور اُس چٹخنی کے جسے وہ دیکھ چکا تھا کہ چڑھی ہوئی ہے اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے دروازہ بند ہو سکتا۔ نہ کنجی کا سوراخ تھا نہ حلقے تھے جن سے معلوم ہو کہ دروازہ مقفل ہے۔ میجر نے خیال کیا کہ ضرور ہے کہ کمرہ سے نکلنے کا کوئی دوسرا رستہ ہو۔ اس خیال سے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا مگر کوئی کھڑکی یا دروازہ یا روشندان نظر نہ آیا ؛

تب تو میجر بہت ہی سٹ پٹایا اور دل میں کہنے لگا "بُرے پھنسے! خدا ہی ہے جو یہاں سے رہائی ملے اور یہ سب میری بیوقوفی۔ مجھے چاہیئے تھا کہ دروازے کی طرف سے اطمینان کر لیتا تب اندر گھستا۔ افسوس کہ مجھ جیسا آدمی جو شاہی گارد کا میجر ہو اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو وہ معمولی چوروں کی طرح اقدام نقب زنی میں چالان کیا جائے۔

اس خیال سے اُس کا دماغ چکرانے لگا اور بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ اُس پر اُسے اور غصہ آیا اور دل میں سوچنے لگا کہ میں اس سے زیادہ خطروں میں مبتلا ہو چکا ہوں لیکن کبھی مجھے ایسی گھبراہٹ نہ ہوئی جیسی اس وقت ہے۔ وہ انہیں خیالات میں مستغرق تھا کہ دفعتہً گھنٹی بجی جسے سُنتے ہی وہ چونک پڑا پیچھے پھر کے دیکھا تو کمرہ کے کونے میں ٹیلی فون لگا ہُوا پایا جس کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس سے اُس کے رہے سہے اوسان اور جاتے رہے۔ جب گھنٹی بجنی موقوف ہی نہ ہوئی تو یہ مجبُوری ٹیلیفون کے پاس گیا اور کان لگا کر سُننے لگا۔ آواز آئی "کون ہو؟" میجر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوبارہ آواز آئی "کون ہے؟

"میجر پھر بھی چپ ہی رہا"

آواز۔ "اگر جواب نہ دوگے تو ابھی پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں گرفتار کرا دیا جائیگا"

میجر (یہ دیکھ کر کہ اگر جواب نہ دیا تو پولیس کا سپاہی آکر حقیقت میں ہتکڑی ڈالے گا)

"کہو کیا کہتے ہو"

آواز۔ "خوب! کہو کیسے ہو؟"

میجر۔ "بڑے مزے میں ہوں۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟"

آواز۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

میجر۔ (یہ خیال کرکے کہ صحیح نام بتانا ٹھیک نہیں) "رچرڈ مارکھم"۔

آواز۔ آپ کی عمر کتنی ہے؟"

میجر۔ (یہ یقین کرکے کہ یہ ضرور کوئی بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر ہے جو اُسے پروفیسر بلہنہ گانا سمجھ کر یہ باتیں پوچھ رہا ہے) "میری عمر تو جو کچھ ہے وہ ہے مگر یہ فرمایئے کہ یہ آدھی رات کیوقت آپ کو اپنی معلومات میں اس اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟"

آواز۔ (میجر کے سوال پر مطلق التفات نہ کرکے) "آپ کی عمر؟ جلدی کیجئے"

میجر۔ "پنتیس سال (اپنے دل میں) ایسے آڑے وقت میں سچ کے سوا چارہ نہیں"

آواز۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پنتیس سال۔ پیشہ؟"

میجر۔ "سپہگری"

آواز۔ "بہت ٹھیک۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پنتیس سال۔ پیشہ سپہگری ابھی تک مُلازمت میں ہیں یا پنشن ملتی ہے؟"

میجر۔ "پنشن پاتا ہوں"

آواز۔ اچھا تو سُنئے۔ رچرڈ مارکھم عمر پنتیس سال۔ پیشہ سپہگری۔ حال پنشن یاب۔ مگر آپ کس درجہ بیوقوف ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے پیشہ کو دھبہ لگاتے ہیں اور پنشن سے ہاتھ دھوتے ہیں"

میجر۔ شرمندہ اور متحیر ہو کر "کیا کہا؟

پروفیسر۔"میں نے یہ عرض کیا کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر آپ اپنی پنشن کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

میجر۔"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بک کیا رہے ہو"

پروفیسر۔"بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گا کہ زیادہ وضاحت سے کام لوں۔ جناب والا آپ چور ہیں۔ آیا خیال شریف میں؟ آپ ریڈیم چرانے آئے تھے لیکن پروفیسر بلیتھ کے مکان میں بند ہو گئے"

میجر۔(گھبرا کر)"ابے تو ہے کون؟"

آواز۔"پروفیسر بلیتھ"

میجر۔"لعنت بہ کار شیطان"

پروفیسر۔"نہیں جناب بدکار چہ پروفیسر بلیتھ کہئے"

میجر۔"آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟"

پروفیسر۔"میں برآمدہ کے پہلے والے کمرہ میں ہوں۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے آپ کے دروازہ کا کمرہ نظر آتا ہے اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے"

میجر۔"آپ چاہتے کیا ہیں؟"

پروفیسر۔"میری منشا کا انحصار آپ کے طرز عمل پر ہے"

میجر۔"وہ کیسے"

پروفیسر۔"وہ ایسے کہ آپ چاہیں تو آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور چاہیں تو مجھے سائنس کے اکتشافات میں مدد دیں کہئے کیا صلاح ہے؟"

میجر۔"یہ سائنس کے اکتشافات کیا بلا ہوتے ہیں؟"

پروفیسر۔"آپ ایک بارہ فٹ مربع کمرہ میں مقید ہیں جس میں ایک تولہ ریڈیم رکھا ہوا ہے"

میجر۔"اچھا پھر"

پروفیسر۔"پھر یہ کہ آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں جو اتنی قلیل الحجم جگہ میں اتنے کثیر المقدار ریڈیم کے ساتھ بند ہوئے۔ اس لئے آپ کے محسوسات سائنٹیفک دنیا میں بہت گراں بہا سمجھے جائیں گے

اس لئے اگر آپ اس وقت تک جب تک آپ کے ہوش و حواس بجا ہیں اپنے محسوسات سے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے رہنے کا وعدہ کریں تو خیر ورنہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں ان دونوں میں سے آپ کونسی بات پسند کرتے ہیں "

میجر" آپ کی توجہات کہ آپنے یہ معاملہ میری رائے پر چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے محسوسات بیان کرکے آپ کے علم میں اضافہ کروں "

پروفیسر۔ جناب رچرڈ مارکھم صاحب میں آپ کا نہایت ہی شکر گذار ہوں لیکن آپ کو پہلے سے متنبہ کئے دیتا ہوں کہ آپ کو جسمانی تکلیف بہت کچھ برداشت کرنی پڑے گی۔ میرا تجربہ کئی گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوگا۔ اور چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف محسوس کیوں نہ ہو نا ممکن ہے کہ دوران تجربہ میں کمرہ کھول کر آپ کو نکل جانے دوں کہئے آپ راضی ہیں یا پولیس "

میجر" (جلدی سے بات کاٹ کر) میں تو کہہ چکا کہ پولیس کے مقابلہ میں مجھے آپ کا سائنس زیادہ عزیز ہے "

پروفیسر" نہایت مہربانی۔ ہاں یہ تو فرمایئے آپ کا قلب کیسا ہے ؟"

میجر۔ نہایت زبردست۔ گھنٹہ کی طرح آواز دیتا ہے "

پروفیسر" نہایت ہی خوب۔ اس قسم کے تجربہ کے لئے دل چاہیئے بھی ایسا ہی "

میجر" (دل میں) یا اللہ۔ برے پھنسے (پروفیسر سے مخاطب ہوکر) آپکو کچھ اور پوچھنا ہے؟

پروفیسر" بہت کچھ۔ گھڑی ہے ؟"

میجر" ہاں ہے "

پروفیسر" آپ ضربات نبض بتا سکتے ہیں ؟"

میجر" بیشک "

پروفیسر" جناب والا آپ تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں کہ آپنے آدھی رات کو غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کمرہ میں آپ کو بند ہوئے ۵ امنٹ تیس سکنڈ ہو چکے ہیں۔ اب بتایئے آپکی نبض کی رفتار کیا ہے "

میجر" تہتر "

پروفیسر "نہائت مہربانی۔ کیا آپ مقیاس الحرارت کا استعمال جانتے ہیں؟"
میجر "بیشک"
پروفیسر "بہت خوب ٹیلیفون کے ڈھکنے پر کاغذ کے پاس ایک نلکی رکھی ہے اس میں سے مقیاس الحرارت نکال لیجئے اور نہایت احتیاط سے بتائیے کہ پارہ کس درجہ پر ہے"
میجر "ستانوے"
پروفیسر "نہایت مہربانی۔ بہت بہت شکریہ مجھے خیال نہیں تھا کہ فوج میں ایسے سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اخبار بھی لوگوں کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں۔ کہ اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں اب آپ مقیاس الحرارت کو دو منٹ تک اپنی زبان کے نیچے رکھیئے اور اس کے بعد مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ اوپر چڑھا"
میجر "(دو منٹ کے بعد) ستانوے"
پروفیسر "بہت بہت مہربانی۔ آپ رسالہ میں تھے یا پیدل میں"
میجر "رسالہ میں"
پروفیسر "رسالہ میں؟ بہت بہت مہربانی۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"
میجر "نہیں"
پروفیسر "تب تو کیا ہی کہنے ہیں۔ آپ کو درد سر کی شکائیت تو نہیں؟"
میجر "ابھی تک تو نہ تھی لیکن آپ کے مسلسل سوالات کی عنائیت سے تھوڑی دیر میں ضرور ہو جائے گی"
پروفیسر "آپ مہربانی فرما کر صرف علامات ہی بتائے جائیے تشخیص کا کام اس خاکسار کے سپرد کر دیجئے۔ آپ کے قلب کی حرکت کی کیا کیفیت ہے؟"
میجر "خوب زور سے دھڑک رہا ہے"
پروفیسر "ابھی کیا آگے چل کر دیکھئے گا کہ کیسا دھڑکتا ہے۔ تنفس کیسا ہے؟"
میجر "دم گھٹا جاتا ہے۔ اگر آپ مجھے تازہ ہوا کھانے کے لئے ایک منٹ کو باہر آنے دیں تو بڑی عنائیت ہوگی"

پروفیسر نہ حضرت تازہ ہوا کو ابھی اپنے تنفس سے زیربار فرمانے کا خیال دل میں نہ لائے۔ تجربہ ختم ہونے سے پہلے آپ کا باہر تشریف لانا ناممکنات میں سے ہے۔ فوج والوں کے ذی ہوش ہونے کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ غلط ثابت ہو۔ کوئی عقلمند شخص دوران تجربہ میں اس قسم کی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اچھا بالفعل کچھ دیر کیلئے میں اپنے سوالات ملتوی کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں میں پھر گھنٹی بجاؤں گا۔ اگر آپ کو مجھ سے کچھ ارشاد کرنا ہو تو میں یہیں حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں آپ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔"

میجر ٹیلیفون کے پاس سے ہٹ گیا۔ کمرہ کی ہوا بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ریڈیم کی شعاعیں زیادہ تیز اور چمکدار ہو چکی تھیں۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو اسے ایک فوری بیچینی محسوس ہوئی جس طرح دہکتی ہوئی آگ کے سامنے جسم کو برہنہ کرنے سے جلن معلوم ہوتی ہے اسی طرح اسے ریڈیم کی طرف بڑھتے وقت ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے سامنے کا حصہ آگ میں جھلس گیا ہے۔ سانس بھی رک رک کر آنے لگی۔ درد سر بھی معلوم ہونے لگا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ کر دیوار کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ میز سے علیحدہ جا کھڑے ہونے سے ان علامتوں کی سختی کم ہو گئی۔ اتنے میں گھنٹی پھر بجی اور پروفیسر کی آواز آئی :-

مناسب ہو گا کہ میں آپ کو متنبہ کر دوں کہ اگر آپ ریڈیم کو ضائع کرنے کی کوشش کرینگے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اگر آپ نے ریڈیم کے ٹکڑے کو توڑ دیا یا کچل ڈالا تو اور بھی مضر ہو گا کیونکہ اس حالت میں اس کے ذرات منتشر ہو کر آپ کے جسم میں نفوذ کر جائیں گے اسوقت جو کیفیت آپ کو محسوس ہو گی۔ وہ نہائت ہی دلچسپ ہو گی بشرطیکہ آپ اس کا تجربہ کرنا چاہیں لیکن نتیجہ کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔ بہر حال اتنا میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ کہ آپ اس نئے زبردست عنصر سے اس حالت میں کسی طرح بچ نہیں سکتے جبکہ آپ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہیں خصوصاً جبکہ وہ کمرہ صرف بارہ فیٹ مربع ہے۔

بیچارے میجر نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ ٹیلیفون کے تار کے دوسرے سرے پر پروفیسر رابرٹ بلتھ فیلو آف دی رائل سوسائٹی۔ ڈاکٹر آف سائنس کھڑے تھے جن کی تحقیقات و

انکشافات نے علمی دُنیا میں ہل چل ڈالدی تھی۔ عام طور سے پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھا اور اپنے اندرونی جذبات کو کبھی شکل سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اُس کے دوست کہا کرتے تھے کہ پروفیسر کے چہرہ پر سوائے اُس حالت کے جبکہ وہ کوئی تجربہ کامیابی کیساتھ کر رہا ہو خوشی کے آثار اور کبھی نہیں پائے جاتے۔ یہ قول بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ رچرڈ مارکھم سابق ملازم رسالہ شاہی وحال مقیم کمرہ پروفیسر موصوف کے بیان کردہ تجربہ کو (جسے انہوں نے قلم بند کر لیا تھا) پڑھ پڑھ کر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ سائنس کی دنیا میں کس قدر اضافہ ہُوا اور جوش مسرت میں پھر پڑھتے تھے۔

"نفس کی رفتار ۳۷ حرارت عزیزی ۹۹۔ قلب کی حرکت بیقاعدہ نہایت ہی عُمدہ نتائج ہیں۔ سانس رُک رُک کر آتی ہے یہ بھی قرین قیاس ہے کیونکہ اُسے مقید ہوئے ۱۳ منٹ گذر چکے۔ جسم مضبوط ہے اسی لئے ابھی تک کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے جناب رچرڈ مارکھم۔ آج تو آپ بے طرح پھنسے۔ اگر آپ مجرم نہ ہوتے تو مَیں آپ کو اس بلا میں پھنساتے ہوئے جھجکتا لیکن بحالت موجودہ تو آپ کو اس سائنس کی راہ میں ضرور یہ مُصیبت جھیلنی چاہئے۔ اگر آج کا تجربہ آپ کے ذہن عالی سے اُتر نہ گیا تو عمر بھر پھر چوری نہ کیجئے گا۔

"حقیقت میں یہ بات عجائبات قدرت سے ہے کہ عقل ہمیشہ مادہ پر غالب آتی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ رچرڈ مارکھم جیسا قوی ہیکل اور زبردست آدمی مجھ جیسے ضعیف ونحیف شخص کے ایک اشارہ سے برابر والے کمرہ میں اس طرح بند ہو جائے جس طرح چوہا چوہے دان میں بند ہو جاتا ہے۔ مَیں نے اپنی تحقیقات کا اشتہار اخباروں میں دیکر اپنی کمال دانش مندی کا ثبوت دیا۔ آجکل جتنے جرائم پیشہ لوگ ہیں سب اخبار پڑھتے ہیں۔ میرا خیال صحیح تھا۔ کہ اس اشتہار پر ضرور کسی چور کی نظر پڑیگی۔ اس کے بعد مَیں نے ریڈیم کو کمرہ کے وسط میں رکھ دیا اور مقابل والی دیوار پر سلفائڈ آف زنک مل دیا تاکہ چور کو ریڈیم ڈھونڈھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہو۔ ایک ایسی دہلیز کا تیار کرنا جس میں سے گذرتے ہی دروازہ کھٹ سے

بند ہو جائے میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اب اس کے بعد اُس کا انتظار تھا کہ چور آئے اور جال میں پھنسے جو ہو کر رہا"

اِس وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر فوراً آرام کرسی پر سے اُٹھا اور ٹیلیفون کے پاس جاکر کہنے لگا۔

"رُچرڈ مارکھم صاحب! کیا آپ کی بیچینی بڑھنے لگی؟ فرمایئے کیا ارشاد ہے"

منیجر "کیا تم خداوند یسوع مسیح کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو؟"

پروفیسر "کہتے تو ایسا ہی ہیں۔ مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟"

منیجر "جو شخص مسیح پر ایمان رکھتا ہو اور بہشت میں جانے کا آرزومند ہو کیا وہ ایسی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ مجھے اِس کمرہ میں بند کرکے دوزخ کی آگ کا ٹکڑا میرے سامنے رکھدے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مَیں اس آگ میں کباب ہُوا جا رہا ہوں اس کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ اِس کے ابخرے میرا دم گھونٹ رہے ہیں۔ اِس کا اثر میرے دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ اگر تم عیسائی ہو تو کمرہ کھولدو اور مجھے باہر نکلنے دو"

پروفیسر "یہ آپ اپنے دماغ کو بیفائدہ تکلیف کیوں دے رہے ہیں۔ آپکا کوئی حق نہیں ہے کہ تجربہ ختم ہونے سے پہلے باہر نکلنے کا نام لیں۔ چونکہ آپ چور ہیں اس لئے آپکو قرار واقعی سزا بھگتنی چاہئے۔ اور آپ تو فوج میں مُلازم رہ چکے ہیں بیسیوں لڑائیاں لڑی ہونگی۔ خون کے نالے بہتے لوگوں کے مینہ برستے دیکھے ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ وہی ہنگامہ بپا ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ میں آپ کی اِس تکلیف کا حال نمک مرچ لگا کر برٹش میڈیکل جرنل میں شائع کردوں گا۔ اور مجھے یقین کامل ہے کہ آپکے خویش و اقارب جب اُسے پڑھینگے تو آپکی ذات پر فخر کرینگے"

منیجر "میں خویش و اقارب سب کو پانی دیچکا ہوں۔ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو تیری اِس بکواس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دروازہ کھولتا ہے تو کھول نہیں تو میں کوئی ایسی بات کر گذروں گا کہ تو عمر بھر پچتائے گا"

پروفیسر "حضرت اس کی طرف سے اطمینان رکھیئے۔ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جسکی طرف سے خدشہ ہو۔ ریڈیم ہے۔ سو اس کے توڑنے سے آپکی جان پر ہی بن جائیگی۔ باقی رہا ٹیلیفون

اس کے ضائع کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیرونی دُنیا سے جو رہا سہا تعلق آپ کا ہے وہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ آپ ہمت کیوں ہارے جاتے ہیں کلکتہ کے بلیک ہول والے واقعہ کا ذکر تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ اُن بیچاروں کی حالت تو آپ سے زیادہ خراب تھی"۔

میجر " تیری اور تیرے بلیک ہول کی ایسی تیسی۔ رہ تو جا ملعون۔ خبیث۔ پاجی۔ اگر جیتا بچا تو تیری ہڈیاں چور چور نہ کر دی ہوں تو نام نہیں"۔

پروفیسر " جناب عالی! آپ اس قدر گرم کیوں ہوتے ہیں۔ مزاج درست رکھئے کمرہ میں چہل قدمی کیجیئے۔ انشاء اللہ طبیعت جلد بحال ہو جائیگی۔ ہاں تھرمامیٹر پھر زبان کے نیچے رکھ کر مجھے بتائے کہ پارہ کتنے درجہ پر ہے۔ سائنس کی کچھ نہ کچھ خدمت بجالاتے رہیئے۔ بیکار رہنا ٹھیک نہیں۔ (دل میں) بچا لو اب تو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ اگر پانچ سنٹی گرام ریڈیم کلورائڈ سے ۸ چوہے تین دن میں مرجاتے ہیں تو ایک تولہ ریڈیم برومائڈ ایک مضبوط آدمی کو کتنے دیر میں بیہوش کر سکے گا۔ اربعہ متناسبہ کا یہ سوال کئی دن سے حل طلب تھا۔ اب وہ وقت آگیا کہ کوئی شخص اس کو حل کرے اور وہ شخص پروفیسر بلبتھ ہوگا"۔

کچھ دیر میں گھنٹی بجی اور آواز آئی:۔

"حرارت غریزی ۱۰۲۔ نبض ۱۰۰۔ ابے او پاپی پروفیسر خدا کے لئے اب تو مجھ پر رحم کر۔ اگر میری خاطر نہیں تو کم از کم اس خیال سے چھوڑ دے کہ تو بھی بال بچّوں والا ہے"۔

پروفیسر (میجر کی بات سُنی ان سنی ایک کرکے) نبض ۱۰۰۔ غالباً ناہموار ہو گی"۔

میجر " اپنی ہی کہے جاتا ہے میری ایک نہیں سُنتا"۔

پروفیسر " رچرڈ مارکھم صاحب از برائے خدا انصاف کیجیئے کہ جو قرارداد مجھ میں آپ میں ہُوا تھا اُس کے لحاظ سے آیا یہ مناسب ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ تجربہ سے خاطر خواہ نتائج مستنبط ہو رہے ہیں آپ اپنی رہائی کے لئے زور دیں اور تجربہ کو آخر تک پہونچانے سے پہلوتہی کریں۔ اگر علمی دُنیا پر احسان نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم ایفائے عہد ہی کے خیال سے اپنی بات پر قائم رہیئے۔ ہاں تو کیا آپ کی نبض ناہموار ہے؟"

میجر " ہاں ہے تو لیکن مرے ہاتھ بھی کھجلا رہے ہیں کہ تیری چاند گنجی کر دیں۔ پروفیسر بلبتھ یاد رکھ

اگر آج مرادم نکل گیا تو خبیث بن کر تجھے اور تیرے گھر بھر کر پانچویں پشت تک کھا جاؤنگا دیکھ لینا تو پاگل ہو کر بھونک بھونک کر کتے کی موت مریگا۔ کھول کواڑ او پاجی گدھے.....“
گالیاں سُن کر پروفیسر ٹیلیفون سے ہٹ گیا اور اپنی مختصر سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا:۔
اُدنے درجہ کے اراذل و انفار کی خاص خصوصیت ہے کہ سختی کیوقت گندہ دہان ہوجاتے ہیں مجھ پر خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ آپڑے ممکن کیا کہ پایہ تہذیب اور درجہ ثقاہت سے گرا ہُوا کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو۔ شرافت خاندانی اور اعلیٰ تعلیم کے یہی توجوہر ہیں لیکن رحیم ڈار کھم نے میرے استفسارات کا جواب جس تشفی بخش طریقہ سے دیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اچھی پائی ہے اِس سے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں شرافت خاندانی بازی لیجاتی ہے“
یہ کہکر پروفیسر نے بڑے فخر سے پھر اپنی ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر گذرنے کے بعد پروفیسر نے اِس خیال سے کہ اس کے قیدی کی حالت ضرور متغیر ہونی شروع ہوئی ہوگی گھنٹی بجائی لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ پروفیسر نے دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ۳۵ سال کا جوان سپاہی ایسی جلدی بیہوش ہو گیا ہو ضرور ہے کہ وہ کمرہ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس دفعہ آہستہ سے جواب آیا جسے سُن کر پروفیسر نے کہا:۔
”جناب آپنے جواب کیوں نہ دیا؟“
میجر ”جیسے میں تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو میرے ہاتھ آجائے تو تجھے کن عذابوں سے ماروں۔ ابے سُنتا ہے کہ نہیں۔ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پھوٹ چلیں۔ اب تو میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس وولیس کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جی چاہے تو گرفتار کرا دے“
پروفیسر ”جناب عالی آپ کی گفتگو پایہ ثقاہت اور درجہ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔ مجھے آپ کے اِس اشتعال طبع پر رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑے اور بڈھوں کی طرح چڑے۔ اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تجربہ ختم تک پہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے اب کہئے نبض کی رفتار کیا ہے؟“

میجر "ایکسو بیس ہے گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر آگے چل کر گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے"

پروفیسر "ہمت نہ ہارئے۔ آپ کے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے؟"

میجر "نیلی تو نہیں سبز ہے؟"

پروفیسر "سبز! ناممکن ہے!"

میجر "ممکن ہے کہ حقیقت میں نیلی ہو کیونکہ میری نگاہ خراب رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتی"

پروفیسر "سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو! سخت تعجب ہے شاید آپ کے ہاتھ میلے ہونگے۔ اس وجہ سے نیلاہٹ میں ہریالی معلوم ہوتی ہوگی آپکی اُنگلیوں میں درد تو نہیں ہوتا؟"

میجر "صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی اُنگلیوں میں بھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں"

پروفیسر "مرحبا اور حرارت عزیزی؟"

میجر "۱۰۳ - ارے میں گرمی کے مارے بھنا جاتا ہوں کیا تو نے مجھے مار ہی ڈالنے کی ٹھانی ہے؟"

پروفیسر "ابھی کُل سوا گھنٹہ ہؤا ہے اس پہ یہ شور برپا کر دیا کہ الامان! ابھی تجربہ کی ابتدا ہی ہے" یہ کہکر پروفیسر برآمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا:-

"کاش ڈاکٹر پ یہاں موجود ہوتا میں ثابت کر کے اُس سے منوا لیتا کہ اُس کی یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ریڈیم کے اثر سے خون کے کارپسل آکسیجن سے خالی ہو کر بیہوشی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میں علمی دُنیا کے سامنے اب یہ اُصول پیش کر سکونگا کہ ریڈیم کے فعل سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور معمول مفلوج ہو جاتا ہے۔ کنٹر بیوقوف ہے اپنی بات پہ اڑا رہا اب اُسے میری بات ماننی پڑے گی"

اتنے میں پھر گھنٹی بجی اور میجر کی آواز آئی:-

پروفیسر! تجھے اچھی طرح سن! اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں یہ ریڈیم نکال جاؤنگا اور تو ہاتھ پتا رہ جائیگا۔ ریڈیم نکال لینے سے میری حالت اس سے تو خراب ہونے سے رہی جیسی اِس وقت

ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد میرا دم نکل جائے اچھا ہے۔

پروفیسر" آپ احمق نہ بنیئے جو تکلیف آپ کو اس وقت ہو رہی ہے اسمیں بہت زیادتی ہو جائیگی۔

میجر" کچھ پرواہ نہیں ہیں ....

پروفیسر ٹیلیفون بند کر کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور دل میں کہنے لگا:۔

اس شخص نے تو مجھے مایوس کر دیا خدا ہی ہے جو تجربہ حسب مراد ختم ہو۔ یہ شخص تو جلدی ہمت ہار گیا۔ آخر رذیل ہے نہ۔ محض گوشت و خون کا تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ جب تک شرافت و علم نہ ہو"

کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے پھر گھنٹی بجائی لیکن اس دفعہ جو جواب اسے ملے ان سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ قیدی کا دماغ چل گیا۔ جو آوازیں پروفیسر کے کان میں رُک رُک کر آئیں وہ یہ تھیں۔

بلتھ کے سر پہ بلی ناچی۔ اوسوار گھوڑا دوڑائے کدھر جاتا ہے۔ برف گر رہی ہے۔ بلتھ پھپا بنا ہوا سڑک پر لٹک رہا ہے۔

پروفیسر۔ مارکھم صاحب خدا کے واسطے حواس بجا رکھیئے۔ مجھے ابھی بہت دیر تک تجربہ کرنا ہے آپکے اختلال حواس سے میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

میجر" اہاہاہا او ہو ہو ہو۔ سوار و تلواریں کھینچ کر بڑھو اور دشمن کو کاٹ ڈالو۔ ہورے۔ جاپانی اور روسی گلے مل رہے ہیں۔ شاباش میرے بہادرو۔ گھر کو پلٹ چلو........ واہ رے میں تلوار سے ایک سارجنٹ میجر کے دو ٹکڑے کر دئے"

اِس کے بعد ٹیلیفون میں قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سُنکر پروفیسر نہایت افسردہ ہُوا۔ تجربہ کے اِس طرح رُک جانے سے اُس کی خوشی خاک میں مل گئی کچھ دیر کے بعد اُس نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی لیکن جواب نہ ملا۔ آخر پروفیسر نے غمزدہ آواز میں کہا:۔

اب تو دروازہ کھولنا ہی چاہیئے۔ یہ شخص بیہوش پڑا ہُوا ہے اور اس حالت میں اگر دیر تک ریڈیم کی شعاعوں کے سامنے رہا تو ممکن ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو"

یہ کہکر اُسنے دروازہ کھولا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر سخت متعجب ہُوا اور دل میں کہنے لگا:۔

یہ ریڈیم کہاں غائب ہو گیا؟ کہیں حقیقت میں نکل ہی تو نہیں گیا؟ آگے بڑھ کر اُس نے

چاہا کہ بٹن دبائے تاکہ کمرہ میں بجلی کی روشنی ہو جائے۔ اس نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ دروازہ بڑے زور سے بند ہو گیا۔ پروفیسر نے کمرہ روشن کر کے چاروں طرف نظر ڈالی مگر نہ قیدی تھا۔ نہ ریڈیم۔ اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی۔

"کیا جناب کمرہ میں تشریف رکھتے ہیں؟

پروفیسر۔ (محوِ استعجاب ہو کر) "کم تم ہو؟"

آواز "جناب والا ہاں خاکسار حاضر ہے۔ آپ کی عمر کیا ہے؟"

پروفیسر "تمہارا سر ہے"

میجر "جناب پروفیسر صاحب برہم نہ ہوجئے آپ کی حرارت غریزی کتنے درجہ ہے؟ مقیاس الحرارت ٹیلیفون کے پاس ہے۔ براہ کرم زبان کے نیچے لگائے اور جیب سے گھڑی نکالکر نبض کی رفتار بھی بتائے"

پروفیسر "نابکار۔ ملعون۔ چور۔ بدمعاش تو ہمارا مذاق اُڑاتا ہے؟"

میجر "جناب عالی آپ کی گفتگو پایہ ثقاہت اور درجہ تہذیب سے گری ہوئی ہے"

پروفیسر "ابے او پاجی سنتا ہے کہ نہیں اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھولدیا تو میں تجھے پولیس کے حوالہ کردوں گا"

میجر "جناب عالی پولیس یہاں کہاں۔ سوائے اس خاکسار کے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے"

پروفیسر "ابے تو نے میرا ریڈیم کیا کیا؟"

میجر "جناب والا۔ ریڈیم نہایت حفاظت سے میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کے حالات خوب اچھی طرح پڑھ لئے تھے۔ ایک سیسہ کی چھوٹی سی ڈبیہ جس کے اندر سیسہ ہی کی ایک اور ڈبیہ بند تھی اور دونوں کے فصل میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ میں اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جب آپ نے مجھے مقید فرمایا ہے تو اس کے کچھ دیر بعد میں نے ریڈیم کو اس ڈبیہ میں بند کر لیا تھا۔ اس ڈبیہ کے باہر نہ اُس کی شعاعیں نکل سکتی ہیں نہ حرارت اثر کر سکتی ہے۔ میرا وقت آپ سے باتیں کرنے میں نہایت عمدہ طور پر صرف ہوا۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ جناب کی خوشگوار باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی"

پروفیسر:۔ مارکھم تو اوّل درجہ کا چھٹا ہوا بدمعاش۔ بے ایمان اور گستاخ ہے مجھے جلد حراست سے نکال ورنہ"

میسمیرز:۔ جناب عالی ناراض نہ ہوجئے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فایدہ پہنچے گا۔ برٹش میڈیکل جرنل میں آپکا جو مضمون طبع ہوگا میں اُسے ضرور پڑھوں گا اور اُس کی تردید میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالونگا اگرچہ میری نبض کی رفتار ۷۲ سے نہیں بڑھنے پائی اور حرارت غریزی ننانوے درجہ سے زیادہ نہ ہوئی۔ اگر مجھ سے شرف مکالمت حاصل کرنے کے بجائے ریڈیم کو فوراً ڈبیہ میں بند کرلیتا تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ لیکن جناب سے ایک فروگذاشت ضرور ہوئی کہ دروازہ کھولتے وقت جناب نے یہ خیال نہ فرمایا کہ جس بوتل کا آپ کاگ کھول رہے ہیں اُس میں اُڑجانے والا جوہر بند ہے۔ براہ کرم کلکتے کے بلیک ہول کا تصور اپنے ذہن عالی میں رکھئے اور مجھے الوداع کہنے کی اجازت دیجئے۔ خدا حافظ ۔

(دکن ریویو) نقاش دکن

نابینا بیوی

(ایک شریف خاندان کی سچی داستان)

کہتے ہیں حقیقت بعض اوقات فسانہ کو بھی مات کرتی ہے۔ یہ سچا واقعہ جو ذیل میں مندرج ہے اِس قول کا مصداق ہے۔ شریف مزاج شوہر نے اپنی مروّت اور رحمدلی سے بیوی کی نابینائی پر پردہ ڈالا۔ خدا نے اسے اس کے صبر کا اجر اس دنیا میں بھی دیا اور آیندہ بھی دیگا۔ اِس خود غرضی اور نفسا نفسی کے زمانہ میں بھی دنیا نیک بندوں سے خالی نہیں

میرے گھر کے برابر۔ دیوار بیچ۔ ایک قاضی صاحب کا مکان تھا۔ یہ بیچارے ایک زمانے میں بڑے متمول آدمی تھے۔ مگر ریاست کی زندگی اور خصوصاً ملازمت انقلاب کی تصویر ہوا کرتی ہے۔ ذرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور آفت برپا ہوگئی۔ اسی طرح ان

شریف قاضی صاحب کے تموّل نے افلاس کا پہلو بدلا اور فقط پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار وقت بچ بچا کر رہ گئی۔ اِسی پر یہ صبر شکر کے ساتھ قانع تھے اور اپنا اپنی بیوی اور بیٹی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے دُور دُور اِن کا شہرہ تھا۔ اور باہر سے اکثر ایسے اشخاص مشکل مسئلے حل کرنے آیا کرتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ مگر چند در چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا۔ مگر ہمسایہ تھا۔ جو واقعات برات کے روز پیش آئے اُن کی خبر برابر مل گئی۔ معلوم ہوا کہ حسب معمول دولہا صاحب کو پہلے سے اِس لڑکی کی نسبت جس سے اب اُن کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا اور عین نکاح کے وقت نہ معلوم کسی بات کے علم پر۔ اُن نئی روشنی کے شیدا۔ انگریزی تعلیم یافتہ دولہا صاحب نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخر کار برات یوں ہی سے واپس گئی۔ اِس کے بعد خود دولہا صاحب سے میری راہ و رسم ہو گئی اور اِس شادی سے انکار کرنے کی وجہ اُنہوں نے اُس غریب لڑکی کی بدچلنی ظاہر کی۔ یہ بات سُن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے۔ اور میں نے اُن سے مِلنا جُلنا کم کر دیا۔ کبھی کبھار وہ اگر مجھ سے ملتے تو شکایت کرتے مگر میں ٹالے بالے بتا کر پیچھا چھڑا لیتا۔ اور راستہ میں بھی اِن سے کترا کر نکل جاتا۔ وہ دراصل مجھ سے محبت کرتے تھے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچے دوست تھے۔

اِسی طرح تقریباً چھ مہینے گزر گئے اور اب گرمی کا موسم آ پہنچا۔ میری والدہ ضعیفہ تو صحن میں ہی سویا کرتی تھیں، مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا۔ چلچلاتی گرمی تھی۔ اور پہر بھر دن رہے سے ہی ہوا بند ہو گئی تھی۔ دونوں وقت ملتے ہی مارا مار کر کے میں نے کھانا کھایا۔ اور حقہ لیکر سیدھا کوٹھے پر جا پڑا۔ چاروں طرف اُجلی اور شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اور تارے اِکا دُکا نظر آتے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر ایک آدھ جھونکا ہوا کا آہستہ آہستہ آتا اور پسینے میں نہائے ہوئے بدن کو ٹھنڈا کر جاتا۔ دماغ میں عجیب فرحت پیدا ہوتی اور تھوڑی دیر کے لئے میں پنکھا ہاتھ سے رکھ کر

حقے کا ایک آدھ گھونٹ پی لیتا۔ دو تین گھنٹے یونہی کروٹیں بدلتے اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کرکے ۱۱ بجے۔ ہوا ذرا سرسرائی۔ اور کچھ جان میں جان آئی چونکہ پہلے سے ہی آنکھیں بند کرکے زبردستی نیند کو بُلا رہا تھا۔ فوراً غنودگی آنے لگی۔ سناٹے کی وجہ سے اِدھر اُدھر کی آوازیں بھی رہ رہکر آجاتی تھیں۔ یکایک مجھے یہ معلوم ہُوا کہ کوئی میرے سرہانے بول رہا ہے۔ اور مَیں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف گھوڑا۔ مگر آدمی تو آدمی پرچھائیں تک نظر نہ آئی۔ تاہم پھر بھی میں اُسی طرف متوجہ رہا۔ کہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی ایک درد بھری آواز آئی۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ آواز قاضی صاحب کی مکان کی چھت پر سے آرہی ہے۔ اب مَیں سنبھل کر بیٹھ گیا اور سُننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے خیال کے موافق ہوا کے ساتھ آواز آئی" خدا جانے۔ لوگ بالک کیا سمجھیں؟ اور کیونکر جگہ جگہ میری بدنامی ہوتی ہو؟ مگر خیر۔ وہی رَبُّ العالمین خوب جانتا ہے۔ مجھے اور کسی سے غرض ہی کیا؟ مگر پھر بھی دُنیا میں بُرا نام نکل جانا بہت .... (آواز تھوڑی دیر کے لئے جاتی رہی اور پھر ہوا کے ساتھ آئی) "پاک بے نیاز! ربُّ العالمین" میرے اوپر رحم کر۔ میری مشکل کو آسان کردے۔ تیرا خوف ہر ہر لحظے بُری حالت کئے دیتا ہے۔ اور شیطان مردود ہر دم کیسے کیسے بھُلاوے دیتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنے والے! اب سوائے تیرے اور کس کا سہارا ہے۔ مَیں تجھ سے ...." (سکوت طاری ہو جاتا ہے اور پھر ہوا کے ساتھ آواز آنی شروع ہوتی ہے) "....اور یہ بھی ہے۔ مگر پاک پروردگار! میں یہ نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو جائے کیونکہ مجھ دُکھیاری۔ اندھی کو کون قبول کریگا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ مَیں پاک ہوں اور باعصمت ہوں۔ اور اب سے میں یہ چاہتی ہوں کہ میری بدنامی نہ ہو۔ اور بُرا کہنے والوں اور مجھ پر الزام لگانے والوں کا مُنہ تو بند کردے۔ اَرحمُ الرّاحمین! تو خود دیکھتا ہے کہ میں آج تک کس قدر نیک اور پاک ہوں" (ہوا رُک جانے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتی ہے اور پھر یہ الفاظ سُنے جاتے ہیں) "....بیشک ہے۔ آخر کو میں بھی جوان ہوں اپنی سہیلیوں کی باتیں سُنتی ہوں تو ضرور رشک ہوتا ہے۔ مگر پاک بے نیاز! مَیں اس بات کی شکایت نہیں کرتی کہ تو نے مجھے اندھا کیوں پیدا کیا؟ اور ہر ایک مجھ سے شادی کرتے

کیوں کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ مَیں ہر طرح تیری رضا پر راضی ہوں۔ اور ہر حالت میں تیرا ہزار ہزار شکر کرتی ہوں۔ البتہ صرف ایک بات چاہتی ہوں کہ یا تو نوجوانی کی اُمنگ اور جوش کو ملیا میٹ کردے کہ میری زندگی آرام سے بسر ہو۔ اور نہیں تو پھر عزت و آبرو کے ساتھ میرا پردہ ڈھانک لے۔ مجھے اِس جھوٹی اور مکار دُنیا سے باعصمت اُٹھا لے" اِن آخری درد بھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی اور بڑی دیر تک کچھ زیادہ سُننے کی کوشش کرکے آخرکار میں لیٹ گیا۔ وہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کرتے رہے۔ اور مجھے ساری رات آنکھوں میں کٹی۔

صبح ہوتے ہی مَیں نے جناب والدہ صاحبہ کی اجازت پر اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے پیغام بھیجا۔ اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا مگر اُن سچے اور پاکباز قاضی صاحب نے اُسکے جواب میں آبدیدہ ہوکر کہدیا " اُن سے یہ کہدینا ابھی صاحبزادہ ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو۔ وہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے۔ اور مَیں تمہارے مرحوم بزرگوار کا سچا نیازمند ہوں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ میری لڑکی کی وجہ سے تمہیں مُصیبت اُٹھانی پڑے۔ اگر تمہیں اِس کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی تو مَیں قیامت کے دن تمہارے والد مرحوم کو کیا مُنہ دکھاؤں گا" اِس جواب نے اور میرے درد بھرے دل نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل سکتے میں کردیا مصیبت اور مایوسی کی زندہ تصویر میرے سامنے تھی اور اُس نے میرے دل پر اس قدر زیادہ اثر کیا تھا۔ کہ میری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلتا تھا۔ بہ مشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کرلیا اور اُس مُصیبت زدہ نابینا لڑکی کے ساتھ چُپ چُپاتے ہی شادی کرلی۔ اب وہ کم نصیب لڑکی میرے گھر میں آئی۔ اور میری بیوی بن کر رہنے لگی۔ اُن کے ذاتی خصائل کی نسبت میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صبر۔ قناعت۔ سچائی۔ ہمدردی۔ محبت اور پاکبازی کی مجسم تصویر تھی۔ اور اکثر اوقات پچھلی رات کبھی میری آنکھ کھُل جاتی تو مَیں ایک عجیب موثر نظارہ دیکھتا۔ وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی اور منت و زاری کے ساتھ دُعا میں مشغول ہوتی اور ہزار ہزار طرح سے بہروں میری ترقی۔ آرام اور آسائش کی دُعائیں پھڑک پھڑک کر دل سے مانگا کرتی۔ حتی الامکان میں بھی

اُس کی خوشی کا خیال از حد رکھتا اور کبھی اُس کی طرف سے غافل نہ ہوتا۔ جب تک میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غائب کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی۔ مگر انہوں نے بھی ایک دن اِس دار فانی کو الوداع کہا۔ اور اُن کے صدمے نے اور زیادہ میری ہمت پست کر دی۔ اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی۔ اور ڈیوڑھی پر فقط ایک نوکر۔ والدہ صاحبہ مرحوم کی آنکھیں بند ہوتے ہی خادمہ نے اُسے تکلیف پہنچانی شروع کی۔ مگر مَیں سچ عرض کرتا ہوں کہ کبھی بھُول کر بھی اُس نے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی۔ اور مجھے اِس بات کی قطعی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز مَیں اتفاقیہ۔ خلاف معمول دوپہر کو گھر میں واپس آیا جبکہ میری بیوی کھانا کھا رہی تھی اور خادمہ دسترخوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن وغیرہ دیکھکر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور مَیں اُس ماما کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ کیونکہ پُورے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا۔ اور اِس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ صرف مجھے اچھا کھلاتی تھی۔ اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے روکھی سوکھی روٹیاں اور بچا کھچا سالن رکھ دیتی تھی۔ اور باقی سب اچھا اچھا تیر کر دیتی تھی اُسی دن سے مَیں صبح کو جب تک کہ میری قابلِ رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہو لیتی تھی باہر نہ جاتا۔ اور دوپہر سے پہلے واپس آ کر کھانا اُسی کے ساتھ کھاتا۔ پھر شام سے ہی گھر میں آپڑتا۔ اور تمام رات کہیں نہ نکلتا۔ اُس کی سچی محبت اور راستبازی نے اِس قدر میرے دلمیں گھر کر لیا تھا کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر مَیں خود کام کرتا۔ اور اُس کے لئے وضو وغیرہ کے واسطے پانی لانے میں مجھے کچھ عار نہ آتی۔ اِس طرح گھر میں گھسے رہنے کی وجہ سے دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگے اور ہر جگہ میرے ہم عمر میرا مضحکہ اُڑانے لگے۔ مگر اس کا خیال مینے کچھ بھی نہ کیا۔ اور میرے معمول میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ اُسی اثناء میں اُن نئے تعلیم یافتہ نوجوان کی شادی جنہوں نے میری نابینا بیوی پر بدچلنی کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور وہ بہت خوشی کے ساتھ ایک متموّل لڑکی کو اپنے گھر لائے۔ مشکل سے ایک برس گذرا ہوگا کہ شکر رنجی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی۔ اگرچہ میں تو اب بھی ایک معزز آدمی کی بیٹی کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا لغو سمجھتا ہوں۔ تاہم تمام شہر میں

یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ اُن کی بیوی آوارہ بدچلن ہے۔ اُنھوں نے اُسے نکال دیا۔ اُس نے اپنے میکے پہنچتے ہی نان نفقہ اور مہر کی نالش ٹھونک دی اور تعلیم یافتہ نوجوان کو چھٹی کا کھایا پیا یاد آگیا۔ غرض خوب عرضی پرزہ ہوتا رہا اور اُن پر اُن کی بیوی کی ڈگری ہوگئی۔ اب اُنھوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی اور بہ مشکل تمام وہ معاملہ رفع دفع ہُوا۔ مگر اِن کی بیوی پھر ان کے گھر میں آگئیں۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی تھکا فضیحتی شروع ہوگئی۔ بہرحال اب اُس ڈگری کا خوف اُن کا غصہ دباتا تھا۔ اور یہ ہمیشہ اپنی بیوی سے جوتیاں کھاتے رہتے تھے۔

اِس دارِ ناپائیدار کے قانون کے موافق مجھ بدنصیب پر ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ اور میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا۔ مَیں نے ڈاکٹر۔ حکیم۔ مُلّا نے۔ سیانے۔ دوا۔ ٹھنڈائی۔ گنڈا تعویذ غرض کچھ نہ چھوڑا۔ مگر بخار میں کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی وہ دن بھر اس مرض کی شدت میں بلبلاتی رہتی۔ اور اُس کے حواسوں پر بنی رہتی۔ میں نے بالکل ہر جگہ کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت گھر میں ہی رہنے لگا۔ وہ برابر چھ مہینے تک بیمار رہی۔ اور اس عرصے میں ہر قسم کی خدمت میں نے ہی کی۔ یہاں تک کہ چوکی پر لیجانا۔ دوا ٹھنڈائی پلانی وغیرہ میرا روزانہ معمول تھا۔ چونکہ اُسے آخر دنوں میں ڈاک بھی لگ گئی تھی۔ اس لئے اُگالدان یا سیلپچی لاکر بھی اُس کے سامنے میں ہی رکھا کرتا تھا۔ اور اکثر قے کی بیماری اور گھبراہٹ میں ایسا بھی ہُوا ہے کہ میرے اُگالدان اُٹھاتے اُٹھاتے اُبکائی آئی اور جوں ہی میں نے اُگالدان سامنے کیا کہ اُس نے ڈالنا شروع کیا۔ جس سے میرے ہاتھ بھی بھر گئے۔ اگرچہ میں تمام شہر میں اب تک نہایت نازک مزاج مشہور ہوں۔ مگر بخدا کبھی مجھے ہاتھ یا آستین بھرنے سے ایسی کراہت نہیں آئی کہ اُس کی محبت پر غالب آکر مجھے اُس خدمت سے باز رکھتی۔ خدا خدا کرکے یہ زمین دیکھنے گئی تو غشی نے آدبایا۔ جیسے ویسے آنکھ بند۔ ایک دن اُس نے متواتر ۱۲ گھنٹے آنکھ نہ کھولی اور مجھے ازحد تشویش ہوئی۔ رات کو تقریباً ۹ بجے جبکہ اُس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اُسے ہوش آیا۔ اور چھوٹتے ہی اُس نے مجھ سے کہا۔ "تم اس قدر کیوں تکلیف اُٹھاتے ہو۔ کیوں مجھے شرمندہ کیئے جاتے ہو۔ اول تو نا بینا ہونے کی وجہ سے تمہاری ہر وقت گھر میں رہنے کی بھی ضرورت

نہیں۔ اور اگر خیر تم نہیں مانتے تو خود ہر ایک کام کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ میں تمہارے ان
احسانات سے کیونکر سبکدوش ہو سکتی ہوں۔ ایک غریب ماں باپ کی لڑکی۔ کم مایہ۔ اپاہج
بیکار۔ لاچار خود دوسروں کی محتاج۔ خدا کے لئے مجھے اس قدر مجبور نہ کرو کہ میں اس شرمندگی
سے مر جاؤں اس پر بھی تمہیں ماما کا اعتبار نہ ہو تو اچھا یہی کرو کہ اپنی شادی کسی سے کر لو۔
وہ تمام گھر بار کا انتظام خود کرے گی۔ اور تمہیں اس قدر زیادہ دردِ سری نہیں کرنی پڑیگی
یہ سمجھنا کہ مجھے سوکن کا کچھ خیال ہوگا کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ بخدا میں تو صرف ایک ایسی احسان کا
کہ تم نے میرا سرتاج بننا پسند کیا۔ تمام عمر کسی طرح بدلا نہیں دے سکتی۔ اور یہ بھی سُن لو کہ سوکناپے
کے پاجیانہ خیالات اس وقت آتے ہیں جبکہ ایک دوسری کی کسی بات پر قبضہ کرنا چاہے۔ مجھے
روپیہ پیسہ۔ حکومت۔ برابری۔ مرتبہ وغیرہ کا قطعی خیال نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ پھر ایسی حالت
میں میں ایک کونے میں پڑی رہونگی اور دو روٹیاں کھا کر تمہاری بہبودی اور ترقی کی
دُعا میں بقیہ عمر گزار دونگی۔ اس طرح رہنے سے اُسے بھی مجھ سے کسی قسم کی پُرخاش نہیں ہو سکتی۔
جب میں اُسے اور تمہیں ہنستے بولتے سُنونگی تو بخدا میری طبیعت بے انتہا خوش ہوگی۔ کیونکہ
واقعی میرے ساتھ شادی کرکے تم نے اپنے اوپر ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ میں سمجھونگی کہ خدا نے
میرے اوپر مہربانیوں اور احسانات کا معاوضہ میرے سامنے دیا۔ سچ کہتی ہوں کہ جہانتک
ہو سکے گا میں اُس کی طبیعت پر میل تک نہ آنے دونگی"۔ کچھ نہ پوچھئے کہ ان الفاظ نے
میرے ساتھ کیا کیا؟ میرے خون میں چکر آیا۔ آنکھوں اور کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔
اور میں نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور چونکہ قاضی
صاحب بھی اس عرصہ میں دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ اُس نے ایک دن اپنی والدہ کو
بُلایا اور ان کے اور میرے سامنے نہایت دردبھرے الفاظ کے ساتھ مہر معاف کر دیا۔ اُدھر
میں روتے روتے بیہوش ہوگیا۔ اُسی دن سے اُسے ہچکی لگ گئی۔ اور پانچ روز تک
ہچکیوں میں مبتلا رہی۔ پانچویں دن صبح کو اُس نے نہایت رُک رُک کر نہ معلوم مجھ سے
کیا کیا کہا۔ مگر آواز کی کمی اور ہچکیوں کے تار نے قطعی نہ سُننے دیا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ
بڑی کوشش کے بعد صرف یہ جملہ سمجھ میں آیا "اگر تمہیں تکلیف ہوئی تو میری رُوح کو صدمہ

ہو گا" اُس دن ۸ گھنٹے برابر میری آنکھوں سے قسم کھانے کو بھی آنسو نہ تھما۔ شام ہوتے ہی وہ نیک اور راست باز نابینا مجھ کم نصیب کو آخری دم تک دُعائیں دیتی رُاہی بقا ہوئی اور میں دُنیا کی تکلیفیں اُٹھانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ میں نے گھر سے نکلنا قطعی چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت تنہائی میں اُس کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتا۔ راقم (ا۔ح)

اِس صبر کا اجر یہ ملا۔ کہ ا۔ح۔ کی شادی اس واقعہ کے ایک سال بعد ریاست کے ایک معزز عہدہ دار کی لڑکی سے ہو گئی اور وہ زیادہ تر ا۔ح کی کہانی ہی سُن کر متاثر ہوئے۔ اب اُنھوں نے اڑھائی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کی جائداد ا۔ح۔ کے نام کر دی ہے۔ اور لڑکی جس سے اب شادی ہوئی ہے۔ پڑھی لکھی۔ باہنر اور حُسن و وفا کی پُتلی ہے۔ یہ اجر دُنیا میں ملا اور آخرت کا حساب کون لگا سکتا ہے۔

سُلطان حیدر جوش (دہلوی)

حضرتِ کُن

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرتِ کُن پیدا ہوتے ہی رحلت فرما گئے۔ اور اب دُنیا میں ان کا نام ہی نام باقی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام موجودات کا وجود انہی جناب کے سہارے سے پایا جاتا ہے یہ مر جاتے جہان سے گذر جاتے تو یکوُن کی صورت نظر نہ آتی۔

لوگوں کو اُن کی موت کا شبہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جو کرشمہ اُنھوں نے اپنی پیدائش کے وقت دکھایا تھا وہ دوبارہ نہ دیکھا گیا۔ ان کی پیدائش سے پہلے نہ آسمان تھا نہ زمین اور نہ یہ تمام غلط اُلٹی سیدھی چیزیں جو آسمان و زمین پر چھائی ہوئی ہیں۔ اور نہ میاں آدم کبھی تھے آج حضرتِ کُن کی زندگی پر بحث کر رہے ہیں ظہورِ کُن سے اوّل غائب تھے مختصر بات یہ ہے کہ نہ پیدا تھا نہ عدم بیچارہ خالی بیٹھا ہوا تھا۔

حضرتِ کُن کے میلاد شریف کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خزانۂ مخفی میں خود نمائی و خود آرائی کا جذبہ اُٹھا۔ اور اس جذبہ نے سکوتِ معدوم کے دریا میں ایک لہر

اور جنبش پیدا کی۔ خواہش نمود کا بادل گرجا اور برسوں کی قید شدہ تجلی نے بادل سے باہر آ کر چمکنا چاہا تو سب سے پہلے حضرتِ کن کو ولادت[1] کا شرف عطا کیا گیا۔ جب یہ حضرت آغوش وہن سے باہر تشریف لائے تو عجیب شان سے آئے۔

ہو حق سناٹے میں زور سے تجلی ہوئی۔ اور ایک سایہ نمودار ہوا۔ یہ سایہ تیزی سے گردش کرتا تھا اور موجودہ عالم کی رنگا رنگ شکلیں اس میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی جاتی تھیں یہانتک کہ اس سایہ کی گردش آہستہ آہستہ تھمی اور وجود عالم جم کر قائم ہو گیا۔

اِس کے بعد نہ پھر کبھی ایسی تجلی ہوئی نہ کوئی اِس قسم کا دوسرا عالم ظاہر ہوا۔ اسواسطے بعض آدمی کہتے ہیں کہ حضرتِ کُن چل ہی بسے ورنہ کبھی تو کوئی اور جلوہ دکھاتے۔

لیکن آدم زاد غلطی کرتے ہیں جو مولا کن کو مُردہ تصور کرتے ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اور ہر روز تجلیاں نازل کرتے ہیں۔ یہ پرانا کارخانہ شب و روز نئے رنگ بدلتا ہے جناب کن نہ ہوتے تو یہ نت نئی رنگینیاں کہاں سے آتیں۔ ہمارا تو اس پر ایمان ہے کہ حضرتِ کُن زندہ ہیں۔ زندہ رہیں گے۔ اور مرنا اِن کے لئے محال ہے کلام ہے تو اس میں ہے کہ آیا اِن کی ولادت کی ضرورت بھی تھی یا نہیں۔ اور جب وہ پیدا ہو ہی گئے تو ان کا وجود کچھ کام بھی آیا یا یُوں ہی افشائے راز کا دھبہ ثابت ہُوا۔

اس معاملہ میں دو خیال ہیں۔ حضرتِ کُن کے حمایتی جو آرائش عالم کی ظاہری بہار کے شیدا ہیں کہتے ہیں۔ کُن نے بڑا احسان کیا جو ہم کو راز کے بند صندوق سے باہر نکالا۔ اور عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ مگر وہ مست قلندر جناب کُن کا بہت شکوہ گزار ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ نہ یہ حضرت تشریف لاتے نہ ہمارے سکون وحدت میں طوفان آتا خشک و تر۔ خیر و شر۔ جاندار و بے جان۔ سینہ سے سینہ لگائے آرام سے سوتے رہتے۔

اب پہاڑ جنگل بیابان میں اکیلے کھڑے ہیں اور شہروں کی رونق و چہل پہل کو ترستے

---

[1] یہاں وہ ولادت مراد نہیں جو ماں باپ کے تعلق سے ہوتی ہے اس قسم کی ہر ولادت سے قرآن شریف کی سورۃ اخلاص میں انکار کیا گیا ہے۔ ہم اس مفکر کو بتا جانتے اور ڈرکے مارے ولادت کی تشریح کر دیتے ہیں۔ حسن نظامی

ہیں۔ شہریات دن کے غل و شور سے اُکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی تنہائی میں شامِ شہر پر حسرت کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے میں خود اپنی اُفتادگی سے نالاں ہوں۔ نقلِ مکان کر نہیں سکتا۔ ورنہ تمہاری طرح سیر کرتا پھرتا۔ سب سے زیادہ انسان اپنی تکلیفیں بیان کرتا ہے۔ بچپن اور جوانی۔ بیماری اور بڑھاپا۔ غریبی و امیری۔ نیکی و بدی۔ سب اس کی جان کے لئے وبال بنے ہوئے ہیں۔ ہم بھی جہاں تک غور کرتے ہیں۔ انسان کی شکایتیں واجبی معلوم ہوتی ہیں۔ پر جہاں اس کو کُن کے سبب آزار دہ پراگندگی نصیب ہوئی ہے طرح طرح کی خوشیاں بھی ملی ہیں جو درجوں اور حالتوں میں تقسیم ہو کر ایسی پُرلطف بن جاتی ہیں کہ عالمِ ایکجائی میں ان کا حاصل ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

حسن نظامی از خانقاہ مبارک حضرت محبوب الٰہیؒ

مآلِ زندگی

اگرچہ اہلِ سائنس نے بہت سی پیچیدگیاں حل کر دی ہیں بلکہ اپنے پُراعجاز شعبدات سے بعض دنیاوی معاملات کو پُراسرار مسائل کے پہلو بہ پہلو کر کے دنیا میں عجیب قسم کی یگانگت پیدا کر دی ہے تاہم کوئی صورت اس ابتدائی شکل [illegible] کی نظر نہیں آتی کہ یہ دنیا کیوں بنی تھی اور اس کا مرجع کدھر ہے۔

سوال اوّل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] نے سچ آزمائی [illegible] صحیح طور پر شروع نہیں کی۔ ممکن ہے کہ سوال ثانی کے طے پانے پر اس [illegible] سر ہو اور وہ لوگ جو اپنی دنیا کو چھوڑ کر [illegible] سے باتیں کرنے کی فکر میں ہیں یا عالمِ ثبات سے روگرداں ہو کر عالمِ دیگر کی طرف متوجہ ہیں کچھ کام کر جائیں۔ ہمیں اُن لوگوں سے کوئی تنازعہ نہیں۔ بلکہ ہم ان کی محنت کی داد دیتے ہیں۔ ہمیں حق ہے بحیثیت مشترکہ دنیادار ہونے کے کہ ان کے پیدا کردہ نتائج سے مستفید ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم بھی ان کی [illegible] رہیں گے۔ [illegible] غالباً ابھی خاصی چلتی گاڑی

میں روڑا اٹکائیں گے ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہم ایسے کام میں پھنسے تو بس تارے گننے لگ جائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن اب آنے والے آ گئے ہیں جب تک یہاں ہیں کوئی صورت خوش رہنے کی پیدا کرنی ناگزیر ہے۔ قانونِ قدرت ہی سب سے زیادہ اشد ہے وہ اپنی حیات کا قائم رکھنا ہے اسی کے لئے محنت مزدوری کرنا کسی پر سنت نہیں ہے۔ کُل حیوانات اس میں مصروف ہیں مگر انسان میں ایک خاص قوتِ تمیز ہے جسسے یہ فکر غرق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ۔

عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

ایک وہ ہیں کہ ہمارے مصروفیت اختیار کرنے کے پکار رہے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لیکن اس تمام شور و شغب سے حاصل کیا ہے۔ استدلال سے اگر کچھ ملتا ہے تو یہی کہ دُنیا کی آفرینش کا کچھ منشا ضرور ہے اور کچھ نہ کچھ انجام بھی ہوگا۔ دُنیا کام کی جگہ ہے نہ آرام کی۔ نسلاً بعد نسلاً کام کیا ہُوا رائیگان نہیں جاتا۔ انگلستان کی صدہا سال کی محنتِ شاقہ اب کام آ رہی ہے۔ ہمارے احباب سوالات لاینحل کے درپے ہیں مگر ہم لوگ جو اُن سا نفیس دماغ نہیں رکھتے عمل کو اپنا مذہب بنائیں تو خوب ہے۔ اگر ہر شخص اپنے تئیں کسی نہ کسی کام کے سلجھانے کے لئے مامور سمجھے تو عجب رنگ جم جائے۔ چند اشخاص کی کمائی یہ بہار لائی ہے اگر ایشیا اور افریقہ کے لوگ بھی دنیا کی ترقی میں دلچسپی لینے لگیں تو دنیا کی ترقی حدِ وہم و قیاس سے آگے بڑھ جائے۔

فرض کرو کہ میں آج خودکشی کر لوں۔ بس یا میں ان تمام مرحلوں سے منہ موڑتا ہوں جو

اس دُنیا میں رہکر مجھے طے کرنے بھتے مَیں خود اپنے اختیارات سے دُنیا کے ایک کارکن کو کم کرتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہا جا رہا ہوں اور پھر اپنی خوشی سے ایک مقام موجودہ کو چھوڑ کر گرداب میں پھنستا ہوں۔ یقیناً انسان میں بزدلی و کوتاہ اندیشی ہے۔ جیسا کہ میرے پیدا ہونے میں مجھ سے مشورہ نہیں لیا گیا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی موت میں "تو کون میں خواہ مخواہ" کا مصداق بنوں۔ پس جب تک ہو سکے زندہ رہنا ٹھیرا تو زندگی کو مفید بناؤ۔ کیا عجب ہے کہ قدرے قلیل کوشش اِن کمزور بازوؤں کی دُنیا کے بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکے قرین قیاس ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کوئی ایسی ضعیف آواز پر آگے بڑھ سکے اور یہ یقینی ہے کہ ایک جان ترقی دنیا کی زنجیر میں ایک کڑی ہو۔

دنیا بہ فراقِ وطنِ اصلی اے دل ۔۔۔ پژمردہ و افسردہ ہے اور ہے بسمل
کچھ کرکے دکھاؤ اے نمک خوار و تم ۔۔۔ تا حشر کے روز جا ئیں بچھڑے سب مل

عبدالحق

سرائے کا نقشہ برسات میں

دلّی کے مشہور داستان گو میر باقر علی صاحب جن کے دم سے داستان گوئی کے مٹتے ہوئے فن کا نام اس شہر میں باقی ہے۔ جس چیز کا بیان کریں اس خوبی سے کرتے ہیں۔ کہ کہا جا سکتا ہے وہ لفظوں میں مصوّری کرتے ہیں۔ ذیل کا مضمون ایک ظریفانہ کہانی کا جزو ہے ہماری درخواست پر اُنھوں نے اُسے قلم بند کر دیا ہے اُس میں بھولے بھٹکے مسافر کی حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو کسی معمولی سرائے میں برسات کے موسم میں جا پھنستا ہے:۔

بارش ہو رہی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ خدا خدا کرکے سرائے کی صورت نظر آئی۔ بے ڈول سنگ خارا کے ٹکڑے اور مٹی سے چنے ہوئے دروازے کے پاکھے بانس کے کواڑ۔ جو بان سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکے سے کبھی بیمار بکّے پھڑپھڑا کے ٹکرا آتے ہیں۔

اور کبھی بھیگی ہوئی کچی گرنے والی دیوار کو صدمہ پہنچاتے ہیں بیلوں کے کھروں سے روندا ہوا گوبر سیاہ سڑی ہوئی مٹی سا گھاس بھس کے تنکے بلگجے بلگجے جھاگ کیچڑ سا کالا پانی دروازے سے بہتا ہوا چلا آتا ہے اور ایک ٹٹی کی ٹوٹنٹی اور کنارہ ٹوٹی ہوئی بدرہی کبھی اوندھی اور کبھی سیدھی ہوکر پانی کے ساتھ ساتھ لڑھکتی ہوئی چلی آتی ہے۔ مسافر بھیگا ہوا لباس پہنے ہوا کے سرد جھونکوں سے دل کانپ رہا تھا ہونٹ نیلے ہوگئے تھے مگر لوگوں کے ہنسنے کے خیال سے تھرتھری کو ضبط کر ٹٹو کو بڑھا اندر آیا تو دیکھا کہ سرائے کے بیچ میں ایک کوآں ہے کہ حل پانی سے بھر کر اوبل رہی ہے۔ سارے صحن میں ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ بیسیوں چھکڑا کھڑا ہوا جس پر پرانی سرکیاں اور بھیگے ہوئے نودلڑے پڑے ہیں۔ بیلوں پر ٹاٹ اور پرانی گدڑی کی جھولیں بھیگی ہوئی پڑی ہیں جن سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں چھکڑے والے بھیگے ہوئے پتھروں کے چولہے بنائے سیلے ہوئے ایندھن کو پھونک رہے ہیں دھواں اُٹھ رہا ہے۔ چہرہ سُرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں بھرتیوں میں دال چڑھا رکھی ہے لوہے کی پراتوں میں چنے کا سا آٹا گوندھا ہوا ہے چار طرف گلے ہوئے سیاہ پھوس کے چھپر جس کا جگہ جگہ سے پھوس ہٹ گیا ہے اور دھوانس لگے ہوئے بانسوں کا ٹھاٹر اور پرانے بان کے بند نظر آرہے ہیں کسی پر مٹکے کا ٹھیکرا اور کہیں پیندا نکلا ہوا کوندا ڈھکا ہے کئی چھپروں پر نیم کے درخت کا سایہ ہے اُن پر زرد زرد پتیاں اور سوکھے ہوئے نیم کے تنکے کوؤں کی گرائی ہوئی ہڈیاں جو بارش سے پھول گئی ہیں کچھ کھمبیاں جن کو عام لوگ بلّی کا موت کہتے ہیں چھپروں پر نکلی ہوئی ایک طرف کو بڑے چھپر کے نیچے بھٹیاری پیڑھی پر بیٹھی ہے جسکا کالا رنگ اوپلا سا چہرہ چندھیاں سی آنکھیں چپٹی ناک گُردا سے ہونٹ اور موٹے موٹے ہاتھ پاؤں سر میں سرسوں کا تیل جو مسافروں کے چراغوں سے بچا ہے پڑا ہوا میڈھیاں گوندھی ہوئی جن میں موباف کی جگہ دیسی سوت کا کلاہ زرد و سُرخ پڑا ہے منہ ہوں کے بلوں میں مٹی اٹی ہوئی ہاتھ گلے میں پیتل کانسی چاندی کا زیور آنوٹ۔ بچھوے۔ چنگری۔ جنگی۔ پکیاں۔ بلے۔ چھلے۔ چھمیا۔ گجری۔ تمنی۔ چوکڑا۔ مرکی۔ بندا۔ کنگن۔ پائل۔ اچری۔ ڈہار۔ ہار۔ حمیل۔ مالا۔ کنٹھ مالا۔ موہن مالا۔ پچلڑا۔ ستلڑا۔ چھندن بندن چھپن۔ پچھلی۔ بازو۔ پلنی۔ ٹیکا۔ ٹٹروا۔ سر پر قند کا سُرخ دوپٹہ لال تلک

نیلی سوسی کا پاجامہ ادھوڑی کی جوتی جس پر ریشم کی مکڑیاں بنی ہوئیں داہنے ہاتھ کی طرف سوکھے ہوئے آم و جامن کے پتّے دس بارہ گرہ کی دونوں طرف سے جھلسی ہوئی لکڑی جسے کوڑا جھونک رہی ہے آگے کے چولہے پر گلا ٹوٹے ہوئے مٹکے کا پیندا رکھا ہے جس پر کئی روٹیاں ڈالدی ہیں ہاتھ میں پیڑا ہے کسی ہانڈی میں ڈوئی چلاتی ہے کسی کا نمک چکھا ایک مسافر چولہے کے رائے میں روٹیاں سینک رہا ہے کسی کا بچّہ رو کر روٹی کا تقاضہ کر رہا ہے میاں بھٹیارے ایک طرف مٹی کا حقّہ جس پر ارنی کا نیچہ بندھا ہوا کپڑے کی جگہ بان لپٹا ہوا مٹی کی چلم اونٹ کی مینگنی کی آگ سے بھری ہوئی کھانس کھانس کر دم لگا رہا ہے۔ ہم بھی پہنچے بی بھٹیاری ہم کو کوئی جگہ بتادو۔

بھٹیاری۔ میاں مسافر وہ سامنے کی کوٹھری خالی ہے۔

میں۔ ٹپکتی تو نہیں۔

بھٹیاری۔ ٹپکنے دپکنے کی تو خبر نہیں۔

میں وہاں آیا تو دیکھا گیلی کوٹھری دو کڑیاں چھت کی چٹخی ہوئیں جگہ جگہ ٹپکا لگا ہے اور زمین میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے ہیں دھواں کا سرخی مائل بودار پانی جمع ہے جب بوند پڑتی ہے تو چاروں طرف پانی اُچھلتا ہے۔

مسافر۔ میاں مہتر جی یہاں آؤ۔

بھٹیارہ۔ میاں آیا۔

مسافر۔ بھائی یہاں تو ٹپکا لگا ہُوا ہے۔

بھٹیارہ۔ میاں آجکل ٹپکے کی نہ کہو بڑے بڑے اسٹیشنوں میں لگا ہُوا ہے۔

مسافر ایک چارپائی تو لاؤ۔

تھوڑی دیر میں ایک چارپائی آئی جس کے ٹوٹے پھوٹے بان بھیگ کر تن گئے ہیں کان نکلا ہُوا دو پایہ اونچے دو نیچے بھٹیارہ نے لاکر بچھائی اور ایک ہاتھ سرہانے کے پایہ پر دوسرا پائنتی کے پایہ پر رکھ کر زور کیا تو ایک چرّا ٹا ہوا اور پائے کھٹ سے بیٹھ گئے۔

بھٹیارہ۔ میاں دو پیسے ہونگے + بھئی اچھا آخر مجبور اسی پر سیلا ہوا بچھونا بچھا کر لیٹ رہا

تھکا ہوا تھا کچھ نیند آ گئی رات کے ۲ بجے ہونگے کہ گرج کی آواز سے آنکھ کھلی بجلی چمکی اور موسلادھار پانی پڑنے لگا ٹپکا شروع ہوا۔ کبھی چارپائی کو ادھر کبھی اُدھر کھینچا۔ عورتوں سے سُنا کرتے تھے تلے دھار اوپر دھار اور سوچتے تھے کہ یہ کیا محاورہ ہے آج معلوم ہوا کہ شاید اسی موقع کو کہتے ہونگے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ بارش ذرا تھم گئی تھی۔ مسافر غریب نے اپنی راہ لی ٭

(ریاقر علی داستانگو)

ایک مغربی درویش

دو گھنٹے پروفیسر ویمبری کی صحبت میں

شہر بوڈا پسٹ اس وقت زوروں پر ہے۔ اہل ہنگری اس کی رونق بڑھانے میں دل وجان سے کوشش کر رہے ہیں۔ دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر دور تک اس پایۂ تخت کی آبادی چلی گئی ہے۔ اس کے عجائب گھر۔ اس کے مدرسے اس کی مجالس مُلکی سب دیکھنے کے لائق ہیں۔ اور لوگوں کو دُور دُور سے کھینچتی ہیں۔ مگر اس کی مشہور یونیورسٹی میں چند باکمال ایسے جمع ہو گئے ہیں جن کا اس کی شہرت کے بڑھنے میں ایک معقول حصّہ ہے۔ اُن میں السنۂ مشرقی کے نامور پروفیسر ویمبری اہل کمال کی صفت اوّل میں ہیں۔ میں جب پچھلے دنوں ایک دوست کی معیت میں سفر کر رہا تھا۔ تو ہمیں پروفیسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مِل گیا۔ حسن اتفاق سے ایک انگریز مہربان نے ایک رسمی رقعہ تقریب مُلاقات کے لئے دیدیا تھا۔ وہ ہم نے پروفیسر صاحب کے پاس بھیجدیا۔ اُس سے ملنے میں آسانی ہو گئی۔ مگر ملاقات کے بعد جس قدر خلیق انہیں پایا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ کسی رقعے کے بغیر بھی اُن کا خلقِ عمیم ہمیں لطف صحبت سے محروم نہ رکھتا۔

پروفیسر ویمبری انگلستان میں اور دیگر ممالک یورپ میں مشرقی معاملات کے متعلق عموماً اور اسلامی معاملات کے متعلق خصوصاً نہایت باخبر مانے جاتے ہیں اور گو کئی دفعہ ہمیں اُن سے

رائے میں اختلاف ہوا ہے۔ تاہم اس امر کا اعتراف کرنا فرض ہے۔ کہ باعتبار مغربی نژاد ہونے کے ان کے معلومات تعجب خیز ہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ برسوں اسلامی ممالک میں رہے ہیں اور عام یورپین لوگوں کی طرح نہیں کہ الگ تھلگ۔ بلکہ گھل مل کر ایک مسلمان طالبعلم کے بھیس میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ استنبول میں پرورش پائی اس لئے ترکی سہولت سے بولتے ہیں۔ تاتاری مدارس میں برسوں رہے۔ اور وہاں عربی فارسی اور دینیات اسلام کی تحصیل کی۔ چونکہ اس زمانے میں درویشی رنگ اختیار کیا تھا۔ اس لئے اب تک اپنے آپ کو درویش کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں وہ رنگ سرایت بھی کر گیا ہے۔ گو اب ان کی بود و باش پوری یورپین ہے۔ اور صحبت بھی زیادہ اپنے مغربی بھائیوں سے ہے۔ تاہم پرانا رنگ اتنا گاڑھا تھا کہ مٹ نہیں سکا۔ اب تک برابر جھلک دکھاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۰۰ء کی ستائیسویں تاریخ اور جمعرات کا دن تھا۔ کہ کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم نے پروفیسر ویمبیری کے دروازہ پر دستک دی۔ ہم انگریزی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مگر سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ لیکن ہماری ٹوپیوں سے کچھ متحیر نہ ہوئی جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس گھر میں ایسے ملاقاتی پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ ہمارے کارڈ اور تقریب ملاقات کا رقعہ اندر لے گئی۔ اس کے بعد بہت جلد ہمیں بلانے آئی اور ان کے کتب خانے کے کمرے میں پہنچا کر چلی گئی کمرہ وسیع اور روشن تھا ایک معقول قالین کا فرش چند کرسیاں ایک آرام کرسی اور دریچے کے پاس کونے میں ایک میز۔ بس کتابوں کی الماریوں اور تین چار تصویروں کے سوا یہی سامان اس وسیع کمرہ کی زینت تھا۔

ایک مسن بزرگ میز کے قریب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھے اور تپاک سے ملے۔ ہاتھ ملایا۔ مزاج پرسی کی اور میز سے ذرا فاصلے پر جہاں تین چار کرسیاں رکھی تھیں، وہاں ہمیں بٹھایا۔ خود بھی لکھنا چھوڑ کر پاس آ بیٹھے ہم نے دیکھا کہ کسی قدر لنگڑاتے ہیں قد میانہ ہے۔ یا اس سے بھی کچھ کم۔ بدن متوسط ہے۔ نہ فربہ نہ لاغر۔ بال سفید ہیں۔

بیٹھتے ہی انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔ کہ فارسی بولتے ہو۔ میں نے کہا "ہاں کسی قدر" بس پھر کیا تھا فارسی میں باتیں ہونے لگیں۔ فارسی نہایت عمدہ بولتے ہیں اور بڑی خوبی یہ ہے

کہ تلفظ اور لہجہ میں وہ نقص نہیں جو اکثر یوروپین علماے علوم مشرقی میں پایا جاتا ہے۔
شایہ مناسب ہو کہ میں اُس گفتگو کے بعض حصے قریب قریب اُن الفاظ میں لکھدوں
جو اُس وقت استعمال کئے گئے۔ کیونکہ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سادہ کتاب تھی جس
پر میں گفتگو کے نوٹ لیتا جاتا تھا۔

پروفیسر ویمبیری۔ از دیدنِ شما خوشحال شدم۔ چند روز بیشو کہ در روزنامہاے خواندم
کہ در استنبول تشریف دارید و موردِ التفاتِ شاہانہ شدہ اید۔

جواب۔ بلے قریب دو ماہ آنجا ماندیم۔ چہ خوب جائے است و خلق عثمانی چہ قدر خوب است۔
الحمدللہ کہ از التفات شاہانہ ہم ممنون شدیم +

پروفیسر۔ بندہ ہم عثمانی ہارا خیلے دوست دارم۔ سالہاے در اندرون استنبول بودم۔ و فیتکہ در
خدمت سُلطان بودم۔ مرا رشید آفندی مے خواندند۔

جواب۔ بندہ ازیں حال آگاہ نبودم۔ بایدکہ چیزے دیگر از احوال خود بفرمائید کہ خیلے
دلپذیر است +

پروفیسر۔ بیشتر از احوال خود در یک کتاب انگریزی نوشتہ ام۔ کہ نامش "حکایت جد و جہد
من" است۔ در لندرہ چاپ شدہ است۔

اِس پر اُٹھے اور ایک الماری سے وہ کتاب اُٹھا لائے میں نے اس کے چند عنوان
سرسری طور پر دیکھے اور ارادہ کیا کہ ضرور پڑھوں گا۔ کیونکہ نہایت دلچسپ تھی۔ اس
کتاب کے پاس ایک کتاب اور رکھی تھی اس کی تقطیع اور جلد وغیرہ ہمارے ہندوستانی
کتابوں کو یاد دلاتی تھی۔ میں نے پوچھا وہ کونسی کتاب ہے۔ بولے خوب یاد آئی یہ کتاب
تمہارے لاہور کی چھپی ہوئی ہے۔ میری اس کتاب کا اُردو میں خلاصہ چھپا ہے اسے
منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار نے شایع کیا ہے اور "سفرنامہ پروفیسر ویمبیری"
اس کا نام رکھا ہے۔ کیا تم انہیں جانتے ہو میں نے کہا کہ جانتا کیا معنے وہ میرے بڑے
دوست ہیں اور لاہور میں ہمارا وقت فرصت بیشتر اکٹھے صرف ہوتا تھا۔ اس سے بہت خوش ہوئے
کہنے لگے۔ اُنہیں بتا دینا کہ میں اُن کے ترجمے کو کس قدر عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ

میں یہ پیغام ضرور ان تک پہنچا دوں گا۔ اور یقیناً وہ اس سے بہت خوش ہونگے۔

اب چونکہ ہم کتابوں کے پاس کھڑے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بعض اور تصانیف دکھائی شروع کیں۔ مگر اُن میں جس کتاب کا نام ہندوستان کے مذاق کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ وہ "ڈی کمنگ سٹرگل فور انڈیا" ہے۔ یعنے وہ جد و جہد جو اہل ہند کو پیش آنیوالی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے متعلق جو بات چیت ہوئی وہ قابل ذکر ہے۔

میں۔ بہ ہند ہیچ نہ رفتہ اید۔ سیاحے مثل شمارا لازم نبود۔ کہ از سیاحت ہند غافل باشد۔

پروفیسر۔ خیلے آرزو داشتم کہ بروم۔ یک بارے از روسائے ہند۔ نواب عبداللطیف صاحب از کلکتہ مرا دعوت کردہ بود۔ و قریب بود کہ بروم۔ لیکن موانع چند مرا ازاں عزم باز داشت۔ حالا پیر شدہ ام ممکن نیست۔

میں۔ چنداں پیر کہ نشدہ اید۔ و اگر پیر ہم باشید۔ چوں ہمت جوان دارید۔ بعد مسافت مضایقہ ندارد۔

پروفیسر۔ بلے راست است لیکن یک مانع دیگر است۔ و آن سیاسی است۔ مے دانید رابطۂ قدیم با قوم انگلیس دارم و کنگ اڈوارڈ بالخصوص برحال درویش التفاتِ بسیار دارد۔ مے بینید آن تصویر از دست و آں دیگر از ملکۂ الکزاندرا ست۔ کہ ہر دو بدست خط خود شان مرا عنائیت فرمودہ اند حالا اگر بہ ہند روم۔ ازیں مے ترسم۔ کہ اگر بعضے از احوال نا ملائم کہ میشنوم بچشم خود بہ بینم۔ دوئم برائے مردم ہند بہ سوز دو چیزے بہ نویسم کہ ازاں مردم انگلزا از من ناخوش شوند۔

میں۔ نزد من ہمیں یک وجہ قوی است کہ زمین شما بہ ہند لازم مے گرداند۔ اگر مردے ہیچو شما از اندیشہائے ایں چنین عزم کارے بہ گذارد۔ کہ از فرائض انسانیت است باز از دیگراں چہ توقع۔

پروفیسر۔ خوب اقطعیاً ناممکن نیست باشد۔ کہ روزبرم۔ چند روز مے شود کہ وزیر صیغہ معارف جاپان مرا دعوت کردہ است کہ سفر جاپان بروم آنجا روم۔ باید کہ ہند را

ہم زیارت کنم ؂

یہ کہکر میز کی طرف گئے اور ایک خط ڈھونڈھ لائے جو انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ اور جسمیں جاپانیوں کی طرف سے فاضل نویسندہ نے پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ کہ وقتاً فوقتاً اُن کے قلم سے جاپانیوں کے موافق مضمون نکلتے رہے۔ اور یہ لکھا تھا۔ کہ فرمانروائے جاپان مکاڈو۔ امید ہے کہ جلد آپ کو کوئی نشان عزت بھیجیں گے اور اگر آپ یہاں آئیں گے تو ہم سب آپ کے نہایت ممنون ہونگے۔

اس میں ہندوستان کی موجودہ حالت اور وہاں کی سیاسی تحریکوں کا ذکر آگیا اور پروفیسر صاحب نے کہا کہ مجھے اُن لوگوں سے جو آزادی کے طلبگار ہیں دلی ہمدردی ہے اور میں یقین واثق رکھتا ہوں کہ آخر کار ہندوستان میں ہندوستانیوں کو اپنا انتظام آپ کرنیکا حق مل جائیگا۔ مگر اس معاملے کی کامیابی خود ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر وہ عقلمندی سے چلیں گے اور قبل از وقت شورشوں سے جن کی خبریں ان دنوں کبھی کبھی آتی ہیں۔ اپنا کام خراب نہ کرلیں گے تو انجام اچھا ہوگا۔ آپ میرا یہ پیغام اپنے اہل وطن کو پہنچا دیجئے۔ اور کہیئے کہ اُن کے ایک غائبانہ ہمدرد کی یہ بے غرضانہ رائے ہے۔ اور اس پر عمل کرنا نہ کرنا اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ مجھے قریب قریب سب یورپی ممالک کے خیالات کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے اور اُس تجربے کی رُو سے میں جانتا ہوں کہ اگر خامی اور ناتجربہ کاری کے ساتھ اہل ہند کی طرف سے کوئی عام شورش موجودہ طرز حکومت کے خلاف ابھی ہوئی تو یورپ بھر کی ہمدردی انگلستان سے ہوگی اور وہ کسی نہ کسی طرح انگلستان کی موافقت کریں گے۔ لیکن اگر اہل ہندوستان متانت کے ساتھ برابر ترقی کرتے رہیں اور رفتہ رفتہ یورپ تک ان کی قابلیت اُنکی معاملہ فہمی انکی صناعی اور اُن کی ہشیاری کی شہرت پہنچ جائے اور اُس وقت وہ اپنے حقوق دعوے کریں تو یورپ کی ہمدردی اُن کی طرف ہوگی غرض اس سارے جھگڑے کی بنیاد محنت استقلال اور صبر پر ہونی چاہیئے۔ نہ کہ جلدبازی اور بے صبری پر۔

مَیں نے اس پختہ کارانہ نصیحت کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ مَیں اسے

اہل وطن تک پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد پھر کچھ کتابوں کی طرف ہم متوجہ ہوئے۔ ایک کتاب جو انہوں نے مجھے آغاز ملاقات ہی میں دکھائی تھی۔ لیکن جس کی ورق گردانی باتوں میں نہیں ہو سکی تھی وہ کتاب بابر نامہ تھی۔ اب اس کی تصحیح میں بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ اسکا اصل نسخہ سر سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ میں تھا وہاں سے منگوا کر نقل لی گئی۔ ایک انگریزی لیڈی نے یہ ساری محنت کی۔ پروفیسر صاحب نے اس کا ذکر اس لئے کیا تھا۔ کہ یورپ کے بعض علم دوست لوگ مشرقی کتابوں کی اشاعت اور نگہداشت کے متعلق وہ خدمت کر رہے ہیں جو اصل میں اہل مشرق کا فرض ہے اور جس سے وہ غافل ہیں۔ اس کا جواب سوائے اپنی غفلت کے اعتراف کے کیا ہو سکتا تھا۔

بابر نامہ کے سرورق پر ایک شعر لکھا۔ جو مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے اس کی تعریف کی۔ وہ بھی پرانے سخن فہم ہیں۔ انہوں نے جوش سے داد دی شعر یہ ہے۔

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

ایک اور بڑی دلچسپ کتاب جو ان کے ہاں دیکھی وہ امیر البحر سید علی رئیس کے سفر نامہ کا ترجمہ تھا۔ یہ ترکی امیر البحر ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان گئے تھے اور جب شاہ ہمایوں کا زینہ سے گر کر انتقال ہوا اس وقت ہندوستان میں موجود تھے۔

ان باتوں میں جن کا خلاصہ اوپر لکھا گیا ہے ایک گھنٹہ کے قریب گذر گیا میں نے اجازت مانگی اور رخصت ہونا چاہا۔ مگر پروفیسر صاحب نے نہایت اخلاق سے روک لیا۔ اور کہا۔

"اگر عجلت نباشد قدرے بنشیند آدم ایں چنیں ہر روز نے آید"

ہم پھر بیٹھ گئے۔ خادمہ قہوہ لائی ہم نے قہوہ پیا۔ کہنے لگے کہ تمہیں ایک وقت ہمارے ساتھ کھانا کھانا چاہئے۔ ہم نے اظہار ممنونیت کیا۔ مگر کہا کہ معذور ہیں۔ آج کے دن یہاں ہیں۔ شام کو وائنا کی طرف روانہ ہوں گے اس پر انہوں نے بہت افسوس کیا۔

کہنے لگے۔

"اگر تا فردا ہم اینجا باشید۔ یک پلاؤ بدست خود برائے شما درست بکنم در ایام درویشی مشق پختن بہم رسانیدہ ام۔"

میں۔ "مرحمت عالی زیاد۔ لیکن بندہ معذور ہستم۔ امروز راہ واشنا گرفتن لازم ہست۔ سفر ما از قرار یکہ داشتیم۔ طول گرفتہ۔ حالا در لوندرہ کار داریم۔ باید کہ زود آنجا برسیم۔ این صحبت کہ بدست رسید۔ ایں را مغتنم خواہیم دانست۔ وایں روز در روزنامۂ یادگار خواہد ماند۔"

پروفیسر۔ لیکن آرزو دارم کہ شمارا باز بہ بینم۔ وقت مراجعت ہند کدام راہ مے روید۔ اگر ازیں راہ بیائید۔ باید مرا از اوّل اطلاعے بدہید کہ منتظر شما باشم۔"

میں۔ بچشم۔ اگر ازیں راہ باز گردم۔ دیدنِ جناب شما فریضہ است۔ و از اوّل خبر خواہم داد۔ خیلے مے خواہم کہ وقتِ بازگشت ایں ہم جاہارا دوبارہ بہ بینم۔ و بہ استنبول ہم یکبار دیگر بروم۔ لیکن گمان نہ دارم کہ ممکن بہ بشود۔ اغلب آنست۔ کہ وا بور بزودی راہِ وطن گیرم۔"

بعد اس گفتگو کے پھر متفرق باتیں شروع ہوئیں۔ ایک تصویر دیوار پر ہمارے سامنے لٹک رہی تھی۔ جس نے میری توجہ کو کئی بار اپنی طرف کھینچا تھا۔ کسی عالم کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ ایک سجادہ پر ایک صاحب اپنی عبا پہنے بیٹھے تھے۔ پانی کا ایک گلی برتن پاس رکھا تھا عمامہ کا شملہ آگے کو لٹک رہا تھا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ یہ کون صاحب ہیں اور ان سے آپ کی کیونکر اور کب دوستی ہوئی۔ کہ اُنھوں نے میری رازجوئی کو تاڑ لیا اور کہا "ہمیں درویش است۔ وقتے کہ در تاتار بودم۔ دریں لباس بودم ایں از آن زمان یادگار است۔"

لارڈ کرزن کی کتاب فارس کے متعلق وہاں پڑی تھی۔ اسے جو میں نے اُٹھایا تو اس کے اندر لارڈ کرزن کا ایک خط رکھا تھا۔ جو اُنھوں نے اپنی کتاب پروفیسر صاحب کو نذر کرتے وقت لکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر بولے "یکے از شاگردان من حاکم ہند بودہ است۔" معلوم ہوا کہ لارڈ کرزن نے چند سبق ان سے لئے تھے۔ اور ڈاکٹر سٹائین جو ہمارے پنجاب میں

رجسٹرار تھے وہ بھی پروفیسر صاحب سے تلمذ رکھتے تھے۔ اور لارڈ کرزن کے عہد میں اُن کو جو عہدہ وسط ایشیا میں تحقیقات وغیرہ کا سرکار کی طرف سے ملا تھا۔ اس میں غالباً پروفیسر صاحب کی سفارش کو بھی دخل تھا۔

لارڈ کرزن اور وسط ایشیا کے تذکرہ سے افغانستان کا اور افغانستان سے امیر عبدالرحمٰن خان کا ذکر آگیا۔ کہنے لگے امیر مرحوم نے بھی ایک مرتبہ بلایا تھا۔ مگر جانا نہ ہو سکا۔ اُنکی دانشمندی اور تدبر کی بیحد تعریف کرتے رہے۔ اور اُن کا ایک قول سُنایا۔ جو خالی از لطف نہیں۔ کہنے لگے کہ روس اور انگلستان کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک دفعہ امیر مرحوم نے کہا تھا۔ در پشت انگریز چیزے نیست مگر آب در پشت روس زمین است "

حکومتِ روس سے پروفیسر صاحب کو دیرینہ مخالفت ہے۔ مگر مسلمانان روس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مسلمانان روس کے کئی اخبار اُن کی میز پر رکھے تھے۔ اور انہیں وہ اکثر پڑھتے رہتے ہیں کہنے لگے کہ تمہارے روسی بھائی بہت معقول ترقی کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ حال میں چھبیس اخبار نئے روسی مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوئے ہیں۔ جن میں بعض بہت قابلیت اور معقول درجہ کی آزادی سے لکھے جاتے ہیں ان میں وقت نام روزانہ اخبار جو اورن برگ سے نکلتا ہے۔ سب سے بہتر ہے۔ قزان مخبری ایک اور روسی اخبار اُنہوں نے مجھے دکھایا۔ جو قزان سے شایع ہوتا ہے۔ روس کا ذکر کرتے کرتے انہوں نے بتایا۔ کہ سُلطان المعظّم سے وہ ربط اب نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ پروفیسر صاحب کو کہتے تھے کہ روس کے خلاف لکھنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ اُن کے مصالح ملکی کے خلاف تھا۔ اور یہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اس کے سوا مجوزہ عثمانی یونیورسٹی کے بارہ میں بھی اختلاف ہوگیا تھا۔ کیونکہ سُلطان المعظّم کی مرضی تھی کہ سر دست تاریخ فلسفہ مغربی کی تعلیم اس میں نہ ہو اور اُنہوں نے عرض کیا کہ "بغیر از فلسفہ و تاریخ یونیورسٹی نے شود "

اخیر میں اکثر عیسائیوں کے مذہبی تعصب کا ذکر کرتے رہے۔ کہتے تھے کہ کئی بھلے آدمی انہیں انجیل اور دیگر مذہبی کتابیں اس نظر سے بھیجتے رہتے ہیں۔ کہ عیسوی مذہب کی طرف

مائل ہو جاویں اور اسلام کی تعریف جو وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ اس سے رک جائیں۔ کہنے لگے وہ نہیں جانتے کہ مَیں کوئی مذہب نہیں رکھتا۔ مَیں بارہا انہیں بتا چکا ہوں کہ مَیں فیلسوف ہوں۔ اور جس مذہب میں جو خوبی دیکھتا ہوں۔ اُس کے اظہار سے نہیں رُکتا۔ باقی خود قید مدّت سے آزاد ہوں۔ اور اتنی مدّت آزادی کا مزا چکھنے کے بعد اب آخری عمر میں گرفتار نہیں ہوں گا۔" ایک آخری لطیفہ اُن کا نقل کئے بغیر میں اپنے مکالمے کے اس مختصر خلاصے کو ختم نہیں کر سکتا اُنہوں نے مجھے بتایا کہ مذہب عیسوی کے بعض پیرو کے جوش کی یہ حالت ہے کہ ایک عیسائی بی بی نے خط لکھا کہ اگر تم بیاہے ہوئے نہیں ہو تو میں تم سے بیاہ کرنے اور اپنی ساری دولت تمہیں دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم عیسائی ہو جاؤ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس آخری دام میں بھی یہ آزادہ رَو مغربی درویش نہیں پھنسا۔

مَیں نے لندن واپس آکر پروفیسر صاحب کو ایک خط لکھا۔ اور اُن سے اُن کی تصویر مانگ بھیجی۔ جواب نہایت عنایت آمیز ملا۔ اور تصویر بھی ساتھ آئی۔ میں اپنے پاس تو اُسے اُن کی نشانی سمجھ کر شوق سے رکھوں گا ہی۔ لیکن مَیں چاہتا ہوں کہ اُس کی ایک نقل میرے دوستوں کو بھی پہنچ جائے۔ اس لئے اس مضمون کے ساتھ اُن کی تصویر بھی بھیجتا ہوں۔

عبد القادر

مغربی تہذیب

قوانین قدرت کا طرز عمل عجب واقع ہوا ہے اور زمانہ کی نیرنگیاں و موجودات عالم کے اختلافات بھی آئے دن عجب گرشمہ دکھایا کرتے ہیں۔ کبھی ایک قوم کا دورہ ہے جسکو تھوڑے ہی عرصہ کے قیام کے بعد کسی نئی آنیوالی قوم کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی ہے۔ گو زمانہ قیام کے بعد میں زیادتی باقی ہو جایا کرتی ہے لیکن انجام سب کا ایک ہی ہوتا ہے اس کی برقی قوت ایسی طاقتور ہوتی ہے کہ باوجود کثیر برائیوں اور متعدد قباحتوں کے

اُس کی نرالی ادائیں اور انوکھی بندشیں اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہیں۔ گو اس میں سمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے لیکن اہل دُنیا کچھ ایسے مہالوٹ ہوجاتے ہیں کہ کچھ سوجھ نہیں پڑتا اور اندھوں کی طرح تقلید پر آمادہ ہوجاتے ہیں چنانچہ ابتداء دُنیا سے سیکڑوں قوموں نے اپنا تمدن قائم کیا جس میں سے چینی - ہندی - مغربی - بابلی - کلدانی - رومن وغیرہ کے تمدن کی شہادت تاریخ میں موجود ہے جو وقتاً فوقتاً دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ اور جب تک زمانے نے مہلت دی اپنے اپنے پارٹ کر کے راہی عدم ہوگئیں یا افلاس و نکبت کے شکار ہوگئیں اور ہمیشہ کے واسطے اپنی سطوت و حشمت وغیرہ کو خیرباد کہکر طوق غلامی گردنوں میں پہن لیا۔ یا زبردستی محکومیت کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالدی گئیں اس سلسلہ میں آخری کڑی عربوں کی تھی جس میں موجودہ مغربی تمدن کی کُنڈی جوڑی گئی ہے عربی تمدن کا دور بھی حسب معمول کچھ عرصہ کے قیام کے بعد "من کل علیہا فان" کا مصداق بنا۔ یہ زمانہ یورپ کی جاہلیت کا زمانہ تھا۔ نیم وحشیانہ حصّوں میں عیسائیت کی برائے نام پیروی ہوتی تھی لیکن نہایت بھونڈے طریقہ سے اور رومن کیتھلک پادریوں کی زیادتیوں کی وجہ سے بُت پرستی تک نوبت پہنچ گئی تھی بلکہ دھڑلے سے کلیساؤں اور گرجاؤں میں تصویر پرستی ہورہی تھی۔ شمالی اقوام تو نری وحشی ہی تھیں جن کو ٹیوٹانک اقوام سے منسوب کرتے تھے انکا مذہب اوہام پرستی اور نجس ارواحوں کی پرستش پر مبنی تھا۔ آڈن و تھار کی ہر قبیلہ میں پرستش ہوتی تھی۔ جہالت کی وجہ سے آپس کے مناقشات اور گھریلو جھگڑوں کی آگ ہر جگہ بھڑک رہی تھی۔ طریقہ مدنیت بھی غیر مذہب اقوام سے ملتا جُلتا تھا۔ اسلامی تمدن کو جب وسعت حاصل ہوئی اور مور لوگ سمندر پار کر کے جبرالٹر کے اِس کنارہ ہوگئے اور مشرق کی طرح سے روس وغیرہ میں اسلامی تمدن کی اشاعت ہوئی تو ان تاریک گھروں میں بھی روشنی نے جھانکنا شروع کیا۔ اور گال (فرانس)، اٹلی (روما) و جرمنی کے علماء نے جوق در جوق علم کی تلاش میں قرطبہ و غرناطہ دمشق و دیگر شامی یونیورسٹیوں میں آنا شروع کیا۔ یہاں انکو ایک نرالا عالم نظر آیا مور جیسی متمدن قوم کو دیکھکر انکی آنکھیں کھل گئیں اپنی قوم کی جہالت و ضلالت پر کفِ افسوس ملنے لگے اور اپنے زخم خوردہ دلوں کا علاج صرف اپنی قوم کی

اصلاح ہی کو سمجھنے لگے۔ اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان کو زمانہ کا ساتھ دینے کے سمجھانے میں وہ مطعون بھی ہوئے سنگسار بھی کئے گئے اور زندہ جلائے بھی گئے لیکن حبّ وطنی اور قومی ہمدردی کا غم ان کے دلوں میں جڑ پکڑ چکا تھا اور وہ بغیر بار آور ہوئے رُکنا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

علم کے شوق نے علمائے نصاریٰ کو اپنے پرانے لٹریچر یونانی و لاطینی کے احیاء کا خیال دلایا اور سیکڑوں طالب علم اس میں مصروف ہو گئے اور دوسرے دور میں تمام لٹریچر کو اپنی اپنی ملکی زبانوں میں ترجمہ کر ڈالا۔

ادھر کروسیڈس (صلیبی لڑائیوں) نے ان کی اپنی فوجی کمزوریوں پر متنبہ کر دیا۔ ان لڑائیوں نے واقعی عجیب اُلٹا اثر دکھایا۔ یعنی فاتح خسارہ میں رہے اور مفتوح فاتح بن گئے عرب تو اپنی فتح کے زعم میں ایسے مدہوش ہوئے کہ بالکل ملیا میٹ ہو گئے اور جو کچھ آتا تھا وہ بھی کھو بیٹھے وہ بھی بھولے مہربان جو کچھ کہ پہلے یاد تھا۔ اس کے برخلاف یورپین لوگوں نے جو سبق اپنی شکستوں سے حاصل کیا اُس کو ایسا ذہن نشین کر لیا کہ بچّہ بچّہ دنیاوی ترقی کی فکر میں مصروف ہو گیا۔ اپنی شخصیت کے قائم کرنے اور اتنی شکستوں کا عوض لینے کا خیال موسمی ہوا کی طرح جگہ جگہ پھیل گیا لوتھر وناگس جیسے رفارمروں کی ہواں دھار اسپیچوں کی آوازیں سوسٹرزلینڈ کے پہاڑی سلسلوں سے ٹکرا ٹکرا کر آواز بازگشت کی طرح تمام صحرا میں گونج اُٹھیں اور عیسائی دُنیا میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ اوہام پرستی اور جھوٹی عبادت کی زنجیروں کے توڑنے میں جن سے تمام یورپ جکڑا ہوا تھا ان کو معجز نما کامیابی ہوئی سیکڑوں اہل قلم ان کے ہم خیال پیدا ہو گئے اور دنیا کو دار المحن و محل صعوبت تصور کرنے کی بجائے اُس کو دار الراحت و جائے قیام پذیر خیال کرنے لگے "سچی مذہبی آزادی" نے اُن کو سائنٹفک تحقیقاتوں اور تاریخی چھان بین و تمدنی دریافتوں میں مصروف کیا۔ یہ زمانہ اصطلاحی معنوں میں "رینے سانس" سے تعبیر ہوتا ہے۔

سب سے اول ترقی کا دور انگلینڈ میں شروع ہوا گو علمی حیثیت سے کہنا چاہئے کہ عنوان اٹلی ہی سے ہوا اور پولیٹکل دور اسپین و پرتگال میں سب سے قبل شروع ہوا

جنھوں نے یورپ کو آزادی کا سبق دیا۔ لیکن اُن کی آزادی نری پولیٹیکل تھی اور اپنے ملک کو غیر قوم سے آزاد کرنا صرف مقصود تھا۔ اس سے یہ لوگ آگے نہ بڑھ سکے۔ حُریت کا حقیقی سبق اگر سچ پوچھو تو انگلینڈ ہی میں دیا گیا۔ ذاتی نفاق شخصی کج بحثیوں اور خاندانی مناقشات و مذہبی و ملتی اختلافات کو مُلکی بہبودی و قومی فلاح پر نثار کرنے و شخصی سلطنت کو بیخ سے اکھاڑ ڈالنے کا سہرا اوّل اوّل انگلینڈ کے سر بندھا۔ اسی ملک میں رعایا کے حقوق کی مساوات انسانی فرائض۔ گورنمنٹ کے حقیقی معانی اہل مُلک کی ذمہ واریوں آزادی رائے و یگانگت کے راز کو افشا کیا گیا۔ نیوٹن کی تحقیقاتوں بیکن کے فلسفہ اور شکسپیر کے ڈراموں نے ایک عجیب معجزنما اثر کیا۔ مُلک کے ہر بچّہ کی رگ و پے میں آزادی کا خون موجزن ہونے لگا اور جزیرہ کے کل باشندے شخصی حکومت کے قطعی دشمن ہو گئے۔ کرامول نے بالآخر شخصی سلطنت کی زیادتیوں سے تمام اہل جزیرہ کو نجات دلائی۔ اور پارلے منٹ کے ہاتھ میں قوم کی باگ دیدی گئی لیکن زمانہ جنگ و جدل کا زمانہ تھا۔ بحری سفر کے شوق نے بہت سے انجانی زمینیں اور نامعلوم جزیروں و براعظموں کو پوشیدگی سے نکال کر جاتی ہوئی دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور آئے دن کوئی نہ کوئی نئی زمین دریافت ہی ہوتی رہتی تھی۔ جس کے قبضہ کرنے پر خوب کُشت و خون ہوتا تھا ماسوا اس کے یورپ میں بھی مثل ایشیا کے شخصی شہنشاہیت کئی جگہ قائم تھی جس کی ماتحت مختلف بادشاہ و حکمران اور چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں ہوتی تھیں زمانہ وسطیٰ بلکہ دو صدی قبل تک آپس ہی میں یہ تاجدار لڑا کرتے تھے یا عناد و کینہ و حسد کی وجہ سے دُور دراز ممالک و مقبوضات میں لڑا جھگڑا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی اُکھاڑ پچھاڑ میں لگے رہتے تھے۔ آپس میں مل کر کام کرنے اور غیر یوروپی اقوام کے مقابل متفق ہو کر سینہ سپر ہونے کا نایاب نسخہ ابھی اُن کے ہاتھ نہیں لگا تھا جس کی اہمت نپولین نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپ کو سکھلائی۔

بھلی چیز ہر کسی کو اچھی معلوم ہوتی ہے، انگلینڈ کی دیکھا دیکھی اس کے جنوبی دوسرے ہاتھ والے پڑوسی نے بھی پلٹا کھایا اور وہاں بھی انگلش لٹریچر نے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی اُمنگیں پیدا کر دیں اور والٹیئر، روسو جیسے اہل قلم پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنی تصنیفات

سے تمام ملک میں ایک شور برپا کر دیا اور تمام کلب گھروں میں آزادی، آزادی کی صدائیں گونج اٹھیں یہ لوگ اپنے استادوں سے بھی بڑھ گئے اور تخت ہی کی ضرورت کو فضول وعبث خیال کرنے لگے ایسے زمانہ میں ان اشخاص کو جو زمانہ کا رنگ دیکھ کر جدوجہد میں لڑ کر نام کر جاتے ہیں اچھا موقع اپنے نام چمکانے کا مل جاتا ہے۔ چنانچہ کارسیکا میں بھی ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا جس نے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنی خداداد قوتوں کا استعمال شروع کیا۔ اس نے اپنے ملکی بھائیوں کو جو آپس میں پھٹے ہوئے تھے اکٹھا کر کے غیر ممالک کے مقابل صف آرا کیا۔ اور اس طلاطم کو جو فرانس میں برپا تھا فرو کر کے دیگر یورپی ممالک کی طرف جنگی دریا کے بہاؤ کا رخ پھیر دیا۔ جو اثر ان نپولینک لڑائیوں کا یورپ پر پڑا وہ تاریخ دیکھنے کے متعلق ہے۔ البتہ اتنا بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کو آپس میں مل جل کر کام کرنے، اور ایک عام دشمن کے مقابل اکٹھا ہو کر لڑنے کے فوائد کما حقہ معلوم ہو گئے۔ یوں تو دو صدی قبل ہی سے لوگوں کے دلوں میں دنیاوی جدوجہد کی خواہش پیدا ہو گئی تھی لیکن عملی فوائد اس کے ان ہی لڑائیوں سے یورپ کو حاصل ہوئے۔ کشاکش زمانہ سے فائدہ اٹھانے، ناسازگاری روزگار، کا مقابلہ کرنے۔ ظاہری مصائب و بیرونی مشکلات پر غلبہ پانے اور قسمت کے پر ہیبت طلسم کے توڑنے کی اصلی کنجی جب ہی ہاتھ لگی۔

آخری حصہ اٹھارویں صدی کا علمی تحقیقاتوں اور سائنٹفک آزمائشات کیمیاوی انکشافات، کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب رہا اور یورپی فلسفی کے اقوال عملیات سے مبدّل ہوتے رہے۔

انیسویں صدی کا آغاز اسی پولیٹکل جدوجہد سے ہوا جس کا فیصلہ واٹرلو کے میدان میں ہمیشہ کے واسطے ہو گیا۔ نپولین کے مقید ہونے کے بعد یورپ میں امن وامان کا دور شروع ہوا لوگوں کو اس بلائے ہر جائی سے چھٹکارا ہوا۔ لڑائی۔ جھگڑے۔ فساد کا خاتمہ ہو گیا۔ لوگوں کو چین سے بیٹھ کر کام کرنے اور دلجمعی کے ساتھ مصروفیت کا موقعہ ملا۔ امن کے قائم ہوتے ہی علم کا چرچہ جو اب تک بہت ہی چھوٹے دائرہ میں محدود تھا ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں ہونے لگا۔ تعلیم سائنٹیفک طریقہ پر دی جانے لگی۔ سائنس کی تحقیقاتوں اور

کیمیاوی دسترسوں اور ٹکنیکل آزمائشوں کو جلا دینے اور عملی لباس نئے تراش وخراش کے ساتھ پہنانے کا خوب ہی موقعہ ہاتھ آیا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کو بھی ترقی ہوتی گئی جو اب تک معکوس نہیں ہوئی۔ اس میں کلام نہیں کہ علم کی عمومیت نے ایک عظیم تغیر دنیا میں پیدا کر دیا ہے۔ سائنٹیفک اور کیمیاوی تحقیقاتوں نے اور ایجادوں نے سفر کی راحتیں نامہ وپیام کی آسانیاں۔ تجارتی کاروبار کی سہولتیں بہت کچھ بڑھادی ہیں۔ ڈاکٹری وطب کی تحقیقاتوں نے بہبودی خلائق وآسائش عامہ میں بہت کچھ حصہ لیا حریت کے سبق نے انسان کو اپنی حقیقت پہچاننے۔ اپنے مساوی حقوق قائم کرنے میں بہت کچھ مدد دی عصبیت کو اپنے اصلی معنوں میں لوگوں نے سمجھا۔ بہت سی برائیاں جو شخصی سلطنتوں میں پائی جاتی تھیں رفع ہو گئیں۔ لیکن علم کا حقیقی مقصد جو ہے اس سے لوگ عموماً بے بہرہ ہیں مادیت نے کچھ ایسی سنگین چادر اہل یورپ کی آنکھوں پر ڈال رکھی ہے کہ روحانیت سے بالکل منحرف ہو گئے ہیں اور مذہب سے گریزاں بلکہ مذہب کے نام سے ایسے مخوف ہوتے ہیں جیسے چھوٹے بچے ہتو اسے۔ اس کو سد راہ ترقی وسعت خیالات کا مانع، تعصب کی جڑ اور کم بینی، و کوتاہ اندیشی، کا موید اور کشت وخون کا باعث ٹھہراتے ہیں۔ مذہبی پیروی کی غیر موجودگی سے ان کے افعال میں بے عنانیت۔ ان کے حرکات میں آوارگی ان کے طبیعتوں میں بیجا جوش اور طینتوں میں کثافت کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ خود بینی، اور اپنے کو اشرف بالا پن کا خیال بچہ بچہ کے دلنشین ہو جاتا ہے۔ ایک قوی تر قوت کے نہ ماننے سے ان کے دل بیرحم وشقی ہو جاتے ہیں۔ سزا وجزاء عاقبت کے نہ قائل ہونے سے جانوریت اور بے موقعہ کی بیباکی پیدا ہو جاتی ہے جو بنی نوع انسان کے لئے مضر ومہلک ثابت ہوتی ہے۔

ایک قوت کو حاضر وناظر نہ ماننے سے ان کے قلوب شقی ہو جاتے ہیں ان کے ادراک فہم میں حس انسانی باقی نہیں رہتی۔ تمام اوصاف حسنہ گو بالکل ہی زائل نہیں ہو جاتے تاہم محبت بنی نوع، اور مخلصانہ اخوت، و برادرانہ برتاؤ خاندانی خصوصیات، نام ونشان کو نہیں باقی رہتے۔ اسی خیال نے یورپ کو شروع سے دیگر ممالک کے غصب کرنے۔ کالے چمڑے والی اقوام کی تذلیل کرنے اور ان کے ساتھ بعید از انسانی سلوک کرنے

میں بیباک کر دیا ہے بلکہ اس کو ان کے ہضم کرنے اور صفحہ ہستی سے ناپید کر ڈالنے کا گویا ایک پروانہ دے رکھا ہے۔ مہذب یورپ آج جو کچھ افریقی باشندوں کے ساتھ کر رہا ہے کون نہیں جانتا۔ مشرقی نیم مہذب اقوام کی جو کچھ ذلّت یورپی اقوام کے روبرو کی جاتی ہے کس سے پوشیدہ ہے۔ اسٹریلیا و امریکہ کے قدیمی باشندوں کے جگر چھیدے جا رہے ہیں۔ ان کو زندہ جلایا جاتا ہے لیکن مہذب یورپ کے تیور تک نہیں بدلتے اور اُن مشتہران تہذیب و داعیان حُب انسان کی ان شرمناک واقعات سے آنکھ تک نہیں نیچی ہوتی۔ سروائول آف دی فٹسٹ کے مسئلہ نے گویا یورپ کو ظلم کرنے اور مُلک کے مُلک ہڑپ کر جانے کے لئے عام اجازت دیدی ہے اگر دیکھا جاوے تو پُرانے مسئلہ یا ہندی مثل جسکی لاٹھی اُس کی بھینس، کو صرف ایک دوسرے قالب میں لاکر دُنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے اس صدی کے سبسے زبردست اور قابل ناز دریافت مسئلہ ارتقا ہے جس پر آج یورپ کے فلسفی کو اِس قدر فخر مباہات ہے لیکن اس کو بھی کچھ ایسا ناموزون لباس پہنایا ہے جس سے نتائج اچھے متصوّر نہیں ہوتے ایک دوسرا فرقہ فلسفیوں کا ہے۔ جو اوپٹمیسٹ (OPTIMIST) کے نام سے پکارے جاتے ہیں جنکا مذہب دُنیا کی ہر چیز کو اچھے معنوں میں لینا ہے۔ لیکن یہ لوگ حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں اور مادیت کے خیال کو اور راسخ بنا دیا ہے۔ ان کا ماحصل زندگی صرف دُنیا میں آرام کے ساتھ بسر کرنا۔ کھانا۔ پہننا۔ کھیلنا کودنا۔ ناچنا۔ گانا۔ بجانا پس جو کچھ ہے وہ یہی ہے چاہے اس میں کسی کی حق تلفی ہو ان کو کوئی پرواہ نہیں۔ اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے ان کی بلا سے۔ دوسرے کا مال غصب ہوتا ہے۔ اور اپنے مُلک کی جیبیں بھری جاتی ہیں تو عین راحت ہے۔ زیادہ اگر کیا تو اپنے مُلک کی ترقی میں ہاتھ بٹانے کو تیار ہو گئے اور دوسری اقوام کو اُلٹی چھری سے ذبح کرنے کے مداعی ایک اور گروہ پازیٹیوسٹ کا ہے۔ خیر ان بیچاروں نے تو غنیمت تھا کہ خدا کو صرف ایک عضو معطل یا یوں کہئے کہ طاق نسیان بٹھا رکھا ہے لیکن اگناسٹکس (دہریہ) تو سب سے بازی لے گئے اور سارا جھگڑا ہی مٹا دیا۔ یہ سب شاخیں ہیں یورپ کے مختلف خیالات کی جنہوں نے ارتقائی قوتوں کے زور سے اس درجہ تک ترقی

حاصل کی ہے۔ لیکن یورپ اِس شاخ میں کوئی نئی تحقیقات نہیں کرسکا یہ سب یونانی فلسفیوں کا تتبع ہے۔ اور ارسطاطالیسی، زینونی، وُلذتی، مذہبوں کی نیویں ہیں جو آج یورپ میں پھیلتی جا رہی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یورپ نے یونانی لٹریچر کے ترجمہ کرنے میں اول ہی سے غلطی کھائی ہے۔ کیمادی تحقیقاتوں میں البتہ بہت کچھ مدد ملی۔ لیکن اخلاقی و مذہبی عقائدی مسایل میں جس طرح سے کہ یونانی حکماء اپنی پروازوں میں چکر کاٹتے رہے اور منزل مقصود کو نہ پہنچ سکے اسی طرح آج یورپ کے فلسفی بھی تخالف آرا مسائل، ولاینحل تحقیقاتوں میں مصروف ہیں جو آئے دن مختلف خیالات کے لباس سے آراستہ ہوا کرتے ہیں آج ایک فلاسفر کچھ کہتا ہے اور کل وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرکے ایک نیا راستہ علمی دُنیا کے روبرو پیش کرتا ہے۔ کل کوئی کچھ اور۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی اپنی ہانک دئے جاتا ہے لیکن حقیقت کو کوئی نہیں پہنچتا افراط تفریط بھی انسانی کیرکٹر میں ایک عجیب مہلک عارضہ ہے جس سے بہت کم لوگ مبری ہوتے ہیں، اور یہی ایک ایسی کمزوری انسان میں ہوتی جاتی ہے جس سے دُنیا کو بہت بڑا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ حریت نے یورپ کو بہت کچھ فایدہ پہنچایا لیکن اس کا بیجا استعمال جب سے شروع ہوا ہے کچھ اچھے نتایج نہیں ظاہر ہوتے۔ طبقہ نسوان کو جب سے آزادی کا سبق دیا گیا عجیب ادھم اُٹھا رکھا ہے۔ حقوق پر حقوق اُن کو ملتے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی شکم پُری نہیں ہوتی۔ جبریت نے اُن کو مساوی حقوق لینے پر آمادہ کر دیا ہے اور وہ اپنے فرائض کو بھول کر مردوں کے کاموں میں دست اندازی کرنے پر کمربستہ ہو گئی ہیں۔ جو کام کہ مرد کرنے سے ڈرتے ہیں اُن کو دریغ نہیں ہوتا۔ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ اب عورتیں اسٹرائکس (ہڑتال) میں مردوں سے دو قدم آگے بڑھی رہتی ہیں۔ لڑنے جھگڑنے بندوقیں چلانے اور تلوار زنی کرنے میں اُن کو باک نہیں ہوتا۔ رجالیت کے غلبہ نے اِن کی نیچرل اداؤں اور دلرُبا کرشموں میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیا ہے جسمیں بے ساختہ پن نام کو نہیں ہوتا اور اپنی ترچھی چتونوں سے گھائل کرنے کے عوض انکو اب شمشیر بکف ہونا پڑتا ہے جو لطف پیدا کرنے کی بجائے بھونڈے پن سے مبدل ہو جاتا ہے۔ اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے بجائے وہ پولٹیکل معاملات میں نہ صرف دلچسپی ہی

لیتی ہیں بلکہ اس میں بہت بڑا حصہ انہیں لوگوں کا ہوتا ہے جس سے ان کے رفیق القلب مزاجوں اور رحم آور طبیعتوں میں متضاد اوصاف بھرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کو امور خانہ داری میں مطلق لطف نہیں آتا تنہائی کو نہایت عزیز رکھنے لگی ہیں اور آزاد زندگی بسر کرنے اور غیر پابندی کے ساتھ اپنی عمر گذارنے کی ازحد خواہشمند رہتی ہیں۔ جس سے دُنیا کو ایک عظیم نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ یہی حال طبقہ ذکور کا ہے۔ ان میں بھی بے عنانیت ایک خطرناک حد تک پہونچتی جاتی ہے گو اب شخصی سلطنت کا نام تک یورپ میں باقی نہیں ہے۔ ہر جگہ آزادی رائے اور انتخاب کا طریقہ رائج ہے لیکن اس سے لوگ اب متنفر ہوتے جاتے ہیں اور اس کو بھی غیر کافی تصور کرتے ہیں سوشلزم (SOCIALISM) کا پریشان کن خواب جب سے یورپ نے دیکھنا شروع کیا ہے سینکڑوں مہذب ڈاکو اور راہزن بلکہ سینہ زور یورپ میں پیدا ہو گئے ہیں جو کسی کو بہ سر حکومت یا ذی اختیار دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ بادشاہ کا قتل کرنا عین ثواب ہے کسی مالدار کو تہ تیغ کر ڈالنا عین موجب راحت ہے۔ یہ مہذب ڈاکو کہیں تو اپنے کو سوشلسٹ سے تعبیر کرتے ہیں کہیں انارکسٹ اور کہیں نہلسٹ سے نامزد کرتے ہیں۔ اپنی اپنی سوسائٹیاں ہیں جو اُن کو ہر طرح کی مدد کرتی رہتی ہیں اور اُن کے حق بجانب ہونے کی تائید کرتی ہیں۔ ان کے خاص خاص اخبار و رسالے چھپتے ہیں جو اوسط درجہ کے آدمیوں اور کم استعداد لوگوں کے بھڑکانے کا کام دیتے ہیں جس سے امن عام میں خلل پڑتا ہے۔ ان کو نہ تو اپنے مرنے کا ڈر ہے اور نہ قید ہونے کا ہراس۔ لاکھوں کھا روپیہ کے اسلحہ و گولہ بارود خریدتے اور نئی نوع کی آزاری کے درپے ہوتے ہیں اسی طریقہ سے پولیٹکل دائروں میں اور ملکی انتظامی حلقوں فرقہ بندیاں ہوتی جاتی ہیں ہر ہر فرقہ اور ہر ہر پیشہ ور اپنے اپنے قائم مقام بڑھانے میں کوشاں رہتے ہیں جس سے لڑائی دنگا فساد روز کھڑا رہتا ہے۔ اور جو چالبازیاں اور مصلحت آمیز دروغگوئیاں رائیوں کے حاصل کرنے میں برتی جاتی ہیں اس سے سچائی اور راست گوئی قلوب سے کافور ہو جاتی ہے اور مدبران یورپ ان مکاریوں دغابازیوں اور فریبوں کے کچھ ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر فریب سے کام نکالنے میں تمام

نہیں ہوتا۔ پارلیامنٹ کے ہادسوں اور پبلک جگھوں میں سفید جھوٹ بولنے میں مطلق دریغ نہیں ہوتا۔ بیان کچھ کرتے ہیں ادا کرتے کچھ ہیں اور دکھلاتے کچھ ہیں۔ ظاہر میں تو نہایت ہی دوست اور ہمدم و رفیق نظر آتے ہیں اگر کہیں پالیں تو کچا کھا جانے میں بھی بند مُنہ نہ رہیں مختلف سلطنتوں کے مدبران اور بادشاہ و پریسیڈنٹ ایک ہی میز پر کھاتے ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں اور ظاہری رابطہ اتحاد کو بہت کچھ مضبوط کر جاتے ہیں لیکن علیحدہ ہوتے ہی پولٹیکل مصلحتوں کی وجہ سے بالکل بیگانہ بن جاتے ہیں جس سے اُن کے افعال و دلی خیالات میں کوئی تعلق سوا مکاری کے نہیں پایا جاتا۔ آجکل سارا دار و مدار اخباروں پر ہے اور جس بے احتیاطی اور بھدّے پن سے آزادی کا استعمال اخباری دُنیا میں ہوتا ہے وہ روز کے واقعات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا رہتا ہے۔ خود غرضی اور ذاتی فوائد، و ملکی ترقی کے خیال نے کچھ ایسا ان لوگوں کو اندھا کر رکھا ہے کہ کبھی سچے واقعات کے کہنے اور بے غرضانہ و غیر جنبہ داری کی رائے دینے کا اُن کو خیال نہیں ہوتا۔ یہاں بھی حضرت زر نے اپنی قوت کا ثبوت دے ہی دیا۔ یہ اخبار مختلف فرقوں کے یا سوسائٹیوں کے نکلتے ہیں جن کی پالیسی اس فرقہ کی رائے کے مطابق ہونی ضروری ہوتی ہے جس کے وہ آلہ ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ اختلاف پیدا کرتے و مباحث کے طول دینے میں کوشاں رہتے ہیں لیکن اس کا اثر تمام ملکی پالیسی پر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ سوسائٹیاں کل ملکی شیرازہ کی ایک جزو ہوتی ہیں۔

دُنیا میں زیادہ حصّہ اوسط عقل والوں کا ہے، جو اپنی کج فہمیوں اور غلط رائیوں کی وجہ سے تغیر پیدا کر دیتے ہیں اور تمام عالم میں بادشاہ سے لے باشندوں تک پر اُس کا اثر پڑتا ہے ظاہر ہے جس میں اِن کا فائدہ ہوتا ہے وہی طریقہ پر اختیار کرتے ہیں اسمیں دغا ہو یا فریب اور یہ وہی ایک کمزوری و خامی ہے جو آجکل اس قدر خرابی ڈالے ہوئی ہے اور آنے والی صدیوں میں بھی اسی کا رونا رہے گا۔

سائینس کی تحقیقاتوں پر بھی مادیت، کا پرتو خوب ہی پڑا ہے اور یورپ کے سائینس دان و حکماء دن رات۔ ہلاک کن آلات، کی اختراع میں لگے رہتے ہیں۔ نئی نئی

توپیں۔ جلد فیر کرنے والی بندوقیں اور زہر آلود سنگینوں کے طیار کرنے میں یورپ کے کارخانے
رات دن مصروف رہتے ہیں۔ میکسیم۔ بے دود کی بارود اور گیس کے گولے جب سے
یورپ میں رائج ہوئے ہیں لاکھوں کھرہا روپیہ اس پر صرف ہو چکا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔
بری فوجی اخراجات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں اور جوں جوں دنیا مہذب ہوتی جاتی ہے
فوجوں میں لاتعداد زیادتی ہی ہوتی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی اس خبط سے
نہیں بچتیں اور وہ بھی حیثیت سے زیادہ جنگی اخراجات پر ضائع کرتی ہیں۔ بحری لڑائی
کا جب سے جنون یورپ کے سر میں سمایا ہے۔ قومی روپیہ سنگریزوں کی طرح بہایا جا رہا
ہے۔ جہاز بھی ہر روز ایک نہ ایک نئے ساخت کے نکل ہی آتے ہیں جس کی خبر مشتہر
ہوتے ہی دیگر سلطنتوں کو بھی طرز جدید کے جہاز بنوانے ضروری ہو جاتے ہیں جن پر
کروڑہا روپیہ صرف ہو جاتا ہے اور مقابلہ ہوتے ہی آن واحد میں جل کر یا ٹکرا کر غرق آب
ہو جاتے ہیں اور کروڑوں روپیہ دیکھتے ہی دیکھتے دریا برد ہو جاتا ہے اور ہزارہا
قیمتی جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز پر بھی دور زمانہ نہیں ہے کہ اوپر ہی اوپر
معرکہ آرائیاں ہوا کریں گی اور ایک تیسری بساط بھی بچھنی شروع ہو جاوے گی کیمیکل آزمائشوں
نے سیکڑوں ایسے زہریلی اور مار ڈالنے والی چیزیں دنیا میں مروج کر دی ہیں جو بات
کرتے کرتے میں اپنا کام کر جاتی ہیں۔ بہت سے ایسے آلات چوروں اور راہزنوں کے
لئے ان موجدوں نے نکالدئے ہیں جو اپنا کام کا کام کر جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک
نہیں ہوتی۔ نقب زنی کے آلات اور دیگر سمیات جب سے ان کے ہاتھ لگے ہیں چوروں
کی بن آئی ہے اور چور بھی کون ہیں مہذب و تعلیم یافتہ بس غضب ڈھا دیتے ہیں۔ جب
سے رونتن ریز دریافت ہوئی ہیں گویا ان کو طلسمی سرمہ مل گیا ہے جو گھر کا فوٹو آنکھوں
کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اور جہاں جہاں چیزیں رکھی ہوتی ہیں۔ ان پہ ہاتھ صاف
کرنے اور کامیاب واپس آنے کا گویا بیمہ ہے۔ ملکی مصلحتوں اور پولیٹیکل ضرورتوں
نے لوگوں کو بھیس بدلنے اور اوزار وغیرہ کی مصنوعیت کو مباح کر دیا ہے۔ اور
لوگ نہایت ہی بیباکی کے ساتھ دوسرے لوگوں کو فریب دیتے اور سالہا سال

پاس رہ کر حکمہ دے کر چلے آتے ہیں جس میں اُن کی بڑی شہرت ہوتی ہے۔ ان کو خلدت و تمغہ دیئے جاتے ہیں، میگزینوں میں تصویریں نکلتی ہیں۔ سامانِ عیاشی کے مہیا کرنے میں بھی سائنس دانوں نے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں اس قدر موجود کردی ہیں جن سے زندگی، نہایت گراں ہو گئی ہے بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے وبالِ جان بن گئی ہے۔ اور یہی ایک ایسا فریب آمود، مرض یورپ میں پھیل گیا ہے جو اُن کو مکاری فریب و دغا دینے و ظلم و ستم کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے بلکہ مجبور کرتا ہے اور روپیہ کی مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ باوجود خطہ کے خطہ عضب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اِن کا جی نہیں آسودہ ہوتا سیکڑوں پولیٹکل چالیں چلی جاتی ہیں ہزاروں صلحنامہ اور اتحادنامہ ہوتے ہیں کہ کسی طرح سے اُبیض نورانی، کی زیارت حاصل ہو لیکن اب مشرقی اقوام بھی چونکتی جاتی ہیں اور وہ زمانہ زیادہ دُور نہیں معلوم ہوتا جب ایشیائی یا یورپی میدانوں میں گذشتہ صدیوں کا سین کھینچنے لگے گا یا اگر یورپ ہی کے میگزین میں آگ لگ گئی تو سب کو خاکستر کر ڈالے گا کیونکہ بارود بھی خوب خشک ہو گئی ہے اور تلواریں بھی نہایت دھار دار اگر ہوئی تو خوب ہوگی خدا وہ دن نہ دکھاوے! ؞

عزیز الرحمٰن

آہ! یہ نظریں!

(ایک ہندوستانی مغنیہ کو)

تھکی ہوئی، تمام شبہائے عشق کی بقیہ مسرت مخمور سے تھکی ہوئی نظریں، ہا تیری آنکھوں سے جو مسرت و شیدا و پر لطف دقیقے دینے کے وعدے کرتی ہیں، اِن آنکھوں سے نکلنے والی ہلکی نظریں!

اِن سیاہ آنکھوں کی سوزان ظلمتوں میں، میں ایک ایسا مبہم اشارۂ دعوت پاتا ہوں

کہ میری روح ان نیوتوں کو دیکھ دیکھ کے حرص سے لرزنے لگتی ہے۔

جب تک کہ تیرا لطف خریدا جاتا ہے، تو چاہے جتنی اونچی ہو، جتنی چاہے اونچی بن، عسیر الحصول نظر آ۔ ہَیں بھی اِک پوری رات، اک لمبی رات، تیرے یاسمینی سینے میں گذارنا چاہتا تھا، مگر میرے شوق، میری آتشِ اشتیاق کو جو تیرا کل وجود و روح چاہتی ہے۔ تیری بے ہیجانی، تیری بے حرارتی! تیری بے محبتی زائل کر دیتی ہے، بجھا دیتی ہے۔

تیرے چاہنے والے جو تیرے دل تک ذرا نہیں پہنچ سکتے، جو پیسہ دیکر تجھ تک پہنچتے ہیں، اُن کے لئے تیرے نشے کس قدر بار، تیرا اظہارِ شوق کس قدر جھوٹا اور تیرا گلے ملنا کس قدر پر استکراہ، تیرے بوسے کس قدر تھکے ہوئے اور سست ہیں۔

یہ جانتا ہوں مگر پھر وہی! یہ آنکھیں، یہ سیاہ آتش سی بھڑکنے والی سیاہ آنکھیں، اور ان کی متلاشی ظلمتیں جو متجسس معلوم ہوتی ہیں یہ خانماں سوز متانت ہیں۔ ان کی تپش میں جب میں اپنے تئیں پاتا ہوں تو میں بھی یہ چاہنے لگتا ہوں کہ چاہے کچھ ہو میں بھی ان آنکھوں کی ظلمتوں میں ڈوب جاؤں، میں بھی اس آتش سے اپنے تئیں جلالوں، اِک رات تو ان آنکھوں سے سرمست آلام ہوں۔

اور اگر کہیں تو اصلی محبت کرے، اُف! کہیں تو اِک ذرا چاہے۔ اُس وقت، دیکھتی ہو، اُس وقت کو سوچ کے اور اپنے پر نظر ڈال کے، اپنی روح کو دیکھ کے، مَیں اس طرح ڈرنے لگتا ہوں جس طرح اک پُر طوفان رات کی پُر شور تاریکی سے کوئی ڈرے۔

نہیں، نہیں، جا، جا، میں نہیں چاہتا۔ اور اپنے ساتھ اپنی اُس آواز کو بھی لیجا جو میری روح کو زیر و زبر کر رہی ہے، اور اس کے تھکے ہوئے نشے کو بھی ساتھ لیجا جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی محترس بغلگیری سے حاصل ہُوا ہے۔

اتنی دُور جا کہ تیری آواز کو، تیرے گانے کو نہ سُن سکوں، تجھے نہ دیکھ سکوں۔ اور اے موسیقی، آہ! اے موسیقی، تو بھی چپ ہو جا۔ وہ غزل نہ گا، وہ راگ نہ ہو گا جو مجھے زندگی کی سب سے بہتر اِک رات کی یاد دلاتا ہے۔ ان حرارتوں کو، ان شعروں کو جو میری روح میں مستور ہیں، بحران و ہیجان نہ دے۔

کیونکہ میں خود اپنے سے، اپنی طاقتِ تحمل سے شبہ کرنے لگا ہوں، کیونکہ میں ڈرنے لگا ہوں کہ میں اس عورت کے لئے سب کچھ کر گزروں گا، میں ڈرتا ہوں کہ میں اپنی متانت کھو بیٹھوں گا، اپنی سلامتی، اپنی انسانیت جسے میں اب تک قائم رکھ سکا ہوں ہاتھ سے دے بیٹھوں گا۔

چپ رہ، دیکھ میں کانپ رہا ہوں، دیکھ میں مرا جا رہا ہوں ٭ (یلدرم)

ایک پھول کی سرگزشت

دیروز زپئے گلاب سے گردیدم
پژمردہ گلے بر سر شاخے دیدم
گفتم تو چہ کردی کہ ترا مے سوزند
گفتا کہ درایں باغ دمے خندیدم

میں آج سے پانچ روز قبل پیدا ہوا۔ دو روز تک تو نیچر نے مجھے بچہ کی طرح ہری ہری پتیوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے کانٹے میری حفاظت کے لئے مقرر کر دیئے تھے۔ مگر انسان کا بچہ تو پیدا ہوتے ہی روتا ہے۔ چلاتا ہے۔ اور ہاتھ پیر پٹکتا ہے۔ مگر میں کچھ ایسا سہا ہوا تھا کہ چپ چاپ انہی نازک نازک پتیوں میں لپٹا ہوا پڑا رہا۔ آنکھیں کھولیں نہ کچھ دیکھا اکثر جانے کیا ہو جاتا تھا۔ کہ میں خوب زور زور سے ہلنے لگتا۔ گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مجھے زور زور سے جھنجوڑ رہا ہے۔ اس ہلنے سے تو میری روح کانپ اٹھتی اور میں اور زیادہ سہم جاتا۔ جب میں دو روز کا ہوا۔ اسوقت مجھے باہر کی کچھ کچھ آواز سنائی دینے لگی۔ باہر میرے اور بھائی [illegible] لگاتے اور یہ کہتے تھے۔ کہ "تو بھی کیا ڈرپوک ہے ذرا باہر نکل [illegible] ہیں لوگ ہماری کیسی تعریفیں کرتے ہیں۔ اور کیسی قدر ہوتی ہے۔ کوئی ہماری خوشبو سونگھتا ہے۔ تو کوئی ہمیں چومتا ہے۔ کبھی کسی کے سر پر بندھتے ہیں تو کبھی کسی کے گلے کا ہار بنتے ہیں غرض ہم

بڑے چین کرتے ہیں۔ ایک تو ہے کہ سمٹے ہوئے لپٹے ہوئے دبکے ہوئے پڑا ہے" یہ سن کر مجھے بھی کچھ گدگدی سی معلوم ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ چہرے سے اپنے سبز نقاب کو الٹ دوں باہر نکل آؤں کچھ دیکھوں کچھ دکھاؤں اپنے دوستوں کی چھیڑ چھاڑ میں شریک ہو جاؤں۔ مگر ادھر حیا روک رہی تھی۔ اُدھر خوف غالب آرہا تھا۔ عجیب کشمکش تھی۔ دو دن تو اسی بےچینی میں گذر گئے پھر تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنے بھائیوں کی باتیں سن سن کر طبیعت بے اختیار ہو گئی اور شوق نے ہاتھ بڑھایا میں نے بھی اب کے ٹھان ہی لی کہ تنگنائے عدم سے فراخنائے ہستی کی سیر کرنے کو نکل آؤں مگر دن کی روشنی میں تو اس کی ہمت نہ پڑی علے الصباح کوئی ۴ بجے کے قریب میں اپنے ہرے ہرے نقاب میں سوراخ کرنے لگا۔ مگر کچھ یہ ایسا مضبوط تھا۔ اور کچھ میں ایسا نازک کہ مجھ سے سوراخ نہ ہو سکا۔ مگر دنیا کی سیر کے خیال نے مجھے ایسا بیقرار کر دیا کہ میں جھنجلا کر تڑپ کر مچل کر پھیل کر غرض کئی ترکیبوں سے اپنے نقاب کو اور اپنی پوشاک کو پھاڑنے لگا۔ آخرش ایک دھیمی آواز سے (جسے لوگ چٹخنا کہتے ہیں) میرا نقاب اُٹھ گیا۔ ادھر اس کا اُٹھنا ہی تھا کہ اُدھر میری باچھیں کھل گئیں۔ چہرہ تمتما اُٹھا۔ ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ غرض خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ شرمیلے چہرے پر ایک ہلکی سی گلابی رنگت چھا گئی تھی۔ اور میں چپکے سے باہر جھانکنے لگا۔ واقعی یہاں عجیب دلچسپی تھی۔ اطراف میں چھوٹے بڑے خوشنما درخت لگے تھے۔ زمین پر سبز فرش بچھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودوں میں خوشنما پھول لگے تھے۔ اس سین کو دیکھ کر میں خوش ہوا۔ مگر حیا نے یہاں بھی میرا دامن نہ چھوڑا۔ میں نہایت شرمایا ہوا تھا۔ اپنی گردن جھکائے ہوئے اور منہ چھپائے ہوئے تھا۔ مگر سچ یہ ہے۔ کہ اس تاک جھانک میں مجھے مزا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹھنڈی ہوا (نسیم سحر) چلنے لگی۔ میں تو بہت گھبرایا اور ڈر گیا مگر میرے دوستوں کو کچھ ایسا مزا آیا کہ مست ہو کر جھومنے لگے۔ ایک دوسرے کو چومنے لگے۔ چھیڑ خانیاں کرنے لگے۔ اُدھر تو یہ شرارت ہو رہی تھی۔ اور ادھر جھینپ کے مارے میری بری حالت تھی۔ پسینہ میں شور بور ہو گیا۔ اتنے میں میرے ایک بزرگ دوست نے چلا کر کہا" بیٹا اس وقت تو تمہارا

حُسن عجیب بہار دکھا رہا ہے۔ وہ تمہارے گلابی چہرہ کی جھلک ان ہری ہری پتیوں میں سے ایک انداز کے ساتھ تمہارا جھانکنا۔ اس پر شبنم کے قطرے تو عجیب ستم ڈھا رہے ہیں۔ خدا تمہاری عُمر دراز کرے تمہاری بڑی قدر ہوگی" یہ سُن کر میں اور بھی جھینپ گیا۔

کچھ عرصے میں مشرق کی جانب سے روشنی دکھائی دی۔ پرندوں نے اپنی راگنیاں شروع کر دیں تھوڑی دیر میں آفتاب بھی نکل آیا۔ اُس کی تیز تیز کرنیں گو مجھے ناگوار گذرتی تھیں۔ مگر اُن کا اثر مجھ پر مفید ثابت ہُوا۔ میں ڈیل ڈول میں بڑھنے لگا۔ اِدھر تو آفتاب کی شعاعیں ستانے لگیں۔ اور اُدھر ایک اور غضب ٹوٹ رہا تھا۔ وہ یہ کہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں مجھے دق کرنے لگیں۔ مجھ پر آ آ کر بیٹھ جاتیں۔ اور ٹھونگیں مارتی تھیں۔ اور نہ میں اتنا قوی تھا۔ کہ اُن کا بوجھ سنبھال سکتا۔ نہ میری نزاکت کا پاس رکھتی تھیں۔ غرض یہ دن پھر عجیب مشکل سے کٹا کہیں یہ چڑیاں پریشان کر رہی تھیں۔ اور کہیں تند ہوا ستا رہی تھی آخر شام ہوگئی۔ ہر چیز خوش نظر آنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں نے اپنی راگنیوں سے پھر ہمیں مست کرنا شروع کیا آفتاب بھی اس وقت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اسکی سنہری کرنیں عجیب بہار دکھلا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں لوگ بھی جوق جوق آنے لگے۔ کوئی ہمیں دیکھ کر تعریف کرتا تو کوئی ہمارے پودے تلے اس گھاس کے سبز فرش پر لیٹ جاتا۔ غرض عجیب چہل پہل تھی۔ تھوڑی دیر میں سُورج غروب ہوگیا۔ لوگ جانے لگے۔ پرند خاموش ہو گئے۔ اندھیرا چھانے لگا۔ ہم بھی چُپکے سے آرام کرنے لگے۔

بہت دیر اسی آرام میں گذر گئی تھی۔ کہ ناگہاں مجھے کچھ شور سُنائی دیا۔ میں گھبرا کر اپنے خواب مست سے چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ میرے دوست آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ میں ہوشیار ہوگیا۔ آج تو واقعی میرا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ کبھی میں اپنی مہک سے مست ہو جاتا۔ تو کبھی اپنے رنگ و روپ کو دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ اپنے حسن کی آپ ہی تعریف کر رہا تھا۔ کہ میرے اسی دوست نے پھر چلّا کر کہا۔ کہ بیٹا آج تو تم اپنی پوری جوانی پر ہو" یہ سُن کر میں شرما کر مسکرایا۔ اس کو دیکھ کر اُس نے کہا۔ اُف یہ تبسّم تو غضب کر رہا ہے" میں بہت ہی جھینپ گیا۔ اسی حالت میں مجھے دیکھ کر میرے دوستوں نے مجھے دق کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں

پو پھٹ آئی۔ اُجالا ہو گیا۔ پھر وہی لگلے دن سے لُطف آنے لگے بُلبلوں کی آواز کان میں پڑنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بُلبلیں آ نکلے پھر مجھے دق کرنے لگیں۔ مگر ایمان کی تو یہ ہے۔ کہ اس ستانے میں مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ اُن کی میٹھی میٹھی آواز سے جی خوش ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک آکر مجھے چمٹ گئی۔ اور اپنی سُریلی آواز سے مجھے اپنی رام کہانی سُنانے لگی۔ میں نے بھی کچھ اُس کی سُنی کچھ اپنی سُنائی۔ اُسے تسلّی دی۔ منایا سمجھایا۔ اور وہ خوش ہو کر پھُر سے اُڑ گئی۔ اسی چہل پہل میں یہ چوتھا دن بھی گذر گیا۔ شام بھی ہو گئی۔ اسی شام کا مجھے بڑا انتظار تھا۔ کیونکہ اب تو مجھے بھی شوق ہو چلا تھا۔ کہ ذرا میں اپنا حُسن دکھاؤں اور لوگوں سے کچھ تعریفیں سُنوں۔ شام کے وہی لُطف آنے لگے۔ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا میری طرف بڑھا مجھے غور سے دیکھا۔ اور ہنس دیا۔ پھر کہنے لگا۔ "افسوس" ع جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے۔ اس دُنیا میں کیا رکھا ہے۔ اور یہاں آنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ اب اس پھُول کو دیکھو۔ یہ اپنے حُسن پر کیا اترا رہا ہے۔ اپنی نزاکت پر کیسا نازاں ہے۔ اپنی خوشبو پر پھُولا نہیں سماتا۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم کہ کل یہ نزاکت یہ حُسن یہ مہک سب خاک میں مل جائیگی۔ پنکھڑی پنکھڑی ایک ہو جائیگی۔ اور یہ برباد ہو جائیگا۔" پھر مجھے غور سے دیکھا۔ ہنس دیا اور چلا گیا۔ اس کی باتیں سُن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ اور میں کانپ اُٹھا۔ اور یہی خیالات آنے لگے۔ کہ میں کیوں پیدا ہُوا۔ چار دن کے لُطف کے بعد پھر بربادی اس سے بہتر تو میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ ان خیالات میں شام ہو گئی۔ رات ہو گئی اور میں سو گیا۔

دوسرا دن نکل آیا۔ مگر میں انہی خیالات میں پریشان تھا۔ بدن میں وہ چُستی نہ رہی پنکھڑیاں کچھ الگ معلوم ہوتی تھیں۔ اور میں پریشان تھا۔ اتنے میں میرے کان میں کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ میں چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ ایک نوجوان میری طرف بڑھا آ رہا ہے۔ قریب آیا اور یہ کہکر "یہ پھُول اچھا ہے" مجھے توڑ لیا۔ اُف اس وقت میری عجیب حالت ہو گئی۔ سب خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ سب مزے کرکرے ہو گئے اپنے دوستوں سے چھُٹ گیا۔ وطن سے الگ ہو گیا۔ اُس نے مجھے ایک رومال میں لپیٹ لیا۔ اور لیکر چلا۔ بہت دیر کے بعد ایک جگہ آ کر ٹھہر گیا اور مجھے رومال سے باہر نکالا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ میں ایک قبرستان میں آ گیا

ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہ ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کچھ پڑھنے لگا۔ پھر جانے اسے کس چیز نے ستایا کہ

دل میں اک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانیے کیا یاد آیا

پھر مجھے اس قبر پر رکھ کر کہنے لگا "اے پھول واقعی تجھ پر میں نے بڑا ظلم کیا۔ مگر بیچارہ میں تجھے اس قبر میں سونے والے کے پاس چھوڑ جاتا ہوں یہ بھی تیری طرح ستم رسیدہ ہے۔ اجل نے اسے بھی اپنے دوستوں سے الگ کیا عزیزوں سے چھڑا دیا۔ وطن سے بے وطن کیا۔ تو اس کے پاس رہ۔ اس سے باتیں کر۔ اس کا دل بہلا۔ کچھ اس کی سن کچھ اپنی سنا۔ اور اپنے دن گذار لے اب میں جاتا ہوں۔ ہاں یہ اگر میری نسبت کچھ پوچھے تو کہدیجو۔ کہ میں یہاں آتا ہوں تیری یاد میں آنسو بہا جاتا ہوں۔ اور تیری زندہ تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ اسی سے اپنے روتے ہوئے دل کو تسلی دیتا ہوں"۔ یہ کہکر چلا گیا۔ میں نے اس سونے والے کو جگانے کی کوشش کی مگر بے سود پھر میں چلایا۔ پکارا۔ جھنجھلایا۔ چیخا مگر وہاں اثر تک نہیں پھر میں نے اسے منایا۔ سمجھایا مگر اس ظالم نے کروٹ تک نہ بدلی۔

ہوائیں غفلت کی چل رہی ہیں اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

میں سخت پریشان ہوا۔ اور اس بیچارے کی ایسی حالت دیکھ کر مجھے سخت قلق ہوا۔ یہ کون ہے کیسا ہے کہاں سے آیا اور کیسے آیا۔ ان خیالات میں غرق تھا۔ کہ مجھے اس بوڑھے کی باتیں یاد آئیں۔ واقعی اُس نے سچ کہا تھا کہ اس دُنیا میں کیا رکھا ہے۔ اور یہاں آنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ انہی خیالات میں میں پریشان تھا۔ کہ میری نظر ناگہاں اپنے جسم پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اب نہ مجھ میں وہ خوبی رہی نہ وہ مہک ہے۔ ان لُٹ رہا ہے۔ پنکھڑیاں گر رہی ہیں۔ رگیں کھنچ رہی ہیں۔ میں گل رہا ہوں۔ بکھر رہا ہوں اور خاک میں مل رہا ہوں*

محمد احمد خدنگ

دل ہی تو ہے

(ترجمہ از فرانسیسی)

بکلاسئے شہر میں موسیو مارگے کی فصاحت کی دھوم تھی۔ پہلے یہ شخص وکالت کرتا تھا۔ بعد میں سرکار کی طرف سے "اڈوکیٹ جنرل" مقرر ہو گیا۔ جب کبھی عدالت سشن میں کوئی بھاری مقدمہ پیش ہوتا تھا۔ تو ملزم کے خلاف تقریر اسی کے سپرد ہوتی تھی۔ اُس کی گونجتی ہوئی آواز مشہور تھی اور اس کی تقریر کی گرمی اور جوش نہایت پُر تاثیر تھا معززین شہر جو بہ طور "جیوری" کے ملزم کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ اُس کی تقریر سے متاثر ہو جاتے تھے۔ لب کشا ہونے سے پیشتر وہ ایک اثر حاضرین پر ڈال لیتا تھا۔ اُسکی صورت گویا اُس وقت مجسم انتقام ہوتی تھی۔ جس کا فرض تھا کہ مُلک کو جرم سے پاک کردے۔ قانون تعزیرات کے عملدرآمد کرانے والے وزیر دولت کا جامہ اُسے خوب زیب دیتا تھا۔ اُس کا عدالت کے کمرے میں آکر اپنی کرسی پر بیٹھنا ملزم کے حواس باطل کر دیتا تھا۔ خود دوسرے وکلا اُن کی لیاقت کے قائل تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ موسیو مارگے کو خدا نے اُس فصاحت کا جو فن وکالت کے لئے درکار ہے خاص حصّہ دیا ہے۔

موسیو مارگے اپنی تمام ہمّت اس خدمت میں صرف کرتا تھا اور اپنی قوت کا استعمال اس سختی کے ساتھ کرتا تھا۔ کہ گویا اُس کو نرم دلی اور رحم سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ ضابطہ فوجداری ہاتھ میں لئے وہ ہر ملزم کے متعلق حکم مناسب لگا دیتا تھا اور رحم کو اس معاملے میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا اُس کی یہ عادت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ کہ کسی نے کبھی اُس کو ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی روزمرہ زندگی ہر قسم کی تفریح سے خالی تھی۔ اور سب خوشیاں چھوڑ کر وہ کام میں محو تھا لوگ اس کی عزّت کرتے تھے۔ لوگ اُس سے ڈرتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ جس بات پر اڑ جائے کبھی اُس سے ٹلنے والا نہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ موسیو مارگے کو ایک ایسی مصیبت کا سامنا ہو چکا تھا جس کا صدمہ اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا او

اس لئے وہ چاہتا تھا کہ سخت محنت سے اپنے غم جانکاہ کو کسی قدر گھٹا دے۔ ابتدائے عمر میں اس کی شادی ایک جوان شریف عورت سے ہوئی تھی جس پر وہ دل سے فدا تھا۔ خدا نے اس بیاہ سے ایک لڑکا دیا۔ جو ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ اُن کی جوانی کی خوشی اور اُن کے بڑھاپے کی اُمید مگر شامت اعمال سے لڑکا بگڑ گیا۔ اور اُس مایوسی نے باپ کا یہ حال کر دیا۔ شاید باپ کی طبیعت کی قدرتی سختی بھی کسی حد تک لڑکے کی خرابی کا باعث ہوئی ہو۔ کبھی کبھی یہ سوال مارگے کے دل میں کھٹکتا تھا مگر پھر اُسے یہ خیال آتا تھا کہ ماں کی طبیعت کی کمزوری لڑکے کے چلن کے بگڑنے کا باعث ہوئی ہوگی۔ لیکن ایسے واقعات کے صحیح اسباب کون بتا سکتا ہے۔ اور ذمہ واری کا ٹھیک حصّہ دریافت ہونے کا کونسا ذریعہ ہے؟

موسیو مارگے نے لڑکے کی نافرمانی سے تنگ آ کر اُس کی اصلاح کی یہ تدبیر سوچی تھی کہ اُسے جہاز پر معمولی ملاحوں میں نوکر کرا دیا جائے۔ تاکہ جہاز کی زندگی کی سختیاں اس کی سرکشی علاج بنیں اور جو طبیعت گھر میں ہر طرح کی کوشش سے راہ راست پر نہیں آسکی۔ وہ جہاز والوں کے احکام کی پابندی سے مائل بہ اطاعت ہو جائے اُس نے جب لڑکے کو اپنا یہ فیصلہ سُنایا اور کہا کہ "تمہیں جانا پڑے گا"، تو لڑکا ناچار بادل ناخواستہ گھر سے نکل پڑا۔ مگر سخت اندوہگین تھا۔ اور غم و غصہ سے جل رہا تھا۔ ماں کی ممتا مشہور ہے۔ لڑکے کو رخصت کرتے وقت زار زار رونے لگی۔ مگر لڑکے کا دل اس بدسلوکی سے پتھر ہو گیا تھا۔ اس نے نہ ماں کے آنسوؤں کی پروا کی اور نہ ان نصائح کی جو باپ نے وقتِ رخصت ضروری سمجھیں۔ دل ہی میں کچھ ارادہ کیا اور چل دیا۔ جہاز کی سختی اس سے کہاں جھیلی جاتی۔ پہلے ہی مقام پر جہاں جہاز کنارے لگا۔ اُتر کے سیر کو گیا اور پھر واپس نہ آیا اُس دن سے برابر مفقود الخبر تھا۔ چھ سال گذر گئے۔ اور باپ کو معلوم تک نہ تھا کہ مر گیا کہ جیتا ہے۔

اوّل اوّل ماں باپ دونوں بیٹھے اپنی اس بدقسمتی پر افسوس کیا کرتے تھے۔ کبھی بیٹے کو کسی مصیبت میں مبتلا تصور کرتے تھے۔ کبھی ڈرتے تھے کہ کسی قید خانے میں ہوگا۔ کبھی کہتے تھے کہ کاش یقیناً معلوم ہو جاتا کہ مر ہی گیا ہے۔ چار آنسو تو بہا لیتے۔ اس کشمکش اور قلبی تکلیف نے آخر ماں کی جان لی ماں کو دمِ واپسیں تک بیٹے کی یاد تھی۔ خاوند کو جو آخری وصیت کی

یہ تھی۔

"اُسے معاف کر دو!"

لڑکا پہلے جا چکا تھا۔ بیوی یُوں رخصت ہوئی۔ اور بیچارہ موسیو مارگے ہمیشہ کیلئے اُن کا ماتم کرنے کو رہ گیا۔ اس حالت میں کام میں دل لگانا اور سخت محنت کرنا ہی اُس کے درد کا درماں تھا اور اس لئے وہ کام میں اس قدر مصروف رہتا تھا۔

آج بھی حسبِ معمول موسیو مارگے کاغذات کا پلندا بغل میں دبائے کچہری کو گیا۔ دل میں مضمونِ تقریر سوچتا جاتا تھا۔ کہ قتل کے اُس مقدمے میں جو عدالت کے سامنے پیش ہونے کو ہے۔ اور جس کا شہر بھر میں بہت چرچا تھا۔ یہ باتیں کہنی چاہئیں اس مقدمے کی شہرت کا زیادہ تر باعث یہ ہُوا۔ کہ قاتل نے عدالت میں اپنا نام بتانے اور ارادۂ جرم کی وجہ بیان کرنے سے قطعی انکار کیا۔ سشن کے کمرے میں لوگ صبح سے مقدمہ سُننے کے لئے جمع تھے۔ اتنے میں چوکیدار نے اعلان کیا" عدالت بیٹھتی ہے" اور افسرانِ سشن سُرخ چوغے پہنے کمرہ میں داخل ہوئے۔ موسیو مارگے اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ آتے ہی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے حسبِ عادت اپنے کاغذات میں مصروف ہو گیا تاکہ فردِ قراردادِ جرم کی تیاری میں اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو پوری ہو جائے اور سرکار کی طرف سے مقدمہ اور مضبوط ہو جائے۔ اتنے میں ملزم بھی داخل ہُوا۔ ایک جوان خوش پوش آدمی۔ عینِ بہارِ شباب میں جس کی ظاہری حالت معمولی مجرموں سے بالکل علیحدہ تھی۔

صدرِ عدالت نے سوال کیا۔ تمہارا کیا نام ہے"؟

ملزم" میں پیشتر بھی اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر چکا ہوں۔ میرا سر آپ کی عدالت کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہے۔ لیکن یہ میرا عزم مصمّم ہے کہ مَیں اپنا راز فاش کئے بغیر مروں گا۔ میرا نام ہرگز کسی کو معلوم نہ ہو گا"!

اِس آواز سے موسیو مارگے کانپ اُٹھا کیونکہ اس کے کان اِس آواز سے آشنا تھے۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ بد قسمت ملزم اس کا گم شدہ لڑکا ہے۔

اُدھر ملزم نے بھی اپنے باپ کو پہچان لیا۔ اور اُس کا دل بھی بے اختیار ہو گیا۔ بچپن کے آرام کے دن اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ماں باپ کی اُن دنوں کی ناز برداریاں یاد آئیں اور ماضی و حال کا یہ تضاد اس قدر گراں گذرا کہ اسے غش آ گیا۔

نوجوان کو اُٹھا کر باہر لے گئے۔ اور مقدمہ ملتوی ہو گیا۔ لوگ بھی اس غیر متوقعہ حادثہ سے متاثر ہو کر گھروں کو چل دئے اور سوچتے جاتے تھے کہ دیکھیں اس عجیب مقدمے کا انجام کیا ہوتا ہے ٭

اڈوکیٹ جنرل اپنے کمرے میں داخل ہُوا تو اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔

کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ اور اپنے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دبا کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ دل سے پوچھنے لگا۔ کہ کیا کیا جائے۔ مدعی بن کر بیٹے کا جرم خود ثابت کرنا اور اسکی جان لینا تو اسے صاف ناممکن نظر آیا۔ البتہ یہ خیال آیا کہ چپکے سے کوئی عذر کر کے کسی کو یہ راز جتائے بغیر یہ مقدمہ کسی اور وکیل کے سپرد کر دے۔ مگر پھر پدری نے گوشۂ دل سے آواز دی کہ بیٹا اگر بچ سکے تو کسی طرح اسے بچانا چاہیئے۔ اس کی تائید میں مرنے والی کی آخری وصیّت یاد آئی کہ "اسے معاف کر دو"۔ اِن الفاظ کا یاد آنا تھا۔ کہ اسے اور سب کچھ بھول گیا۔ نہ یہ خیال رہا کہ لڑکے کے کیا کیا قصور تھے۔ نہ یہ کہ اب وہ کسی جُرم کا مُلزم ہے۔ اتنا ہی یاد رہ گیا کہ "میں باپ ہوں وہ بیٹا ہے"۔ اور وہ اڈوکیٹ جنرل جو سنگدل مشہور تھا۔ زار زار رونے لگا اور طبیعت ذرا سنبھلی تو اُٹھا اور اس نے بے پس وپیش نوکری سے اپنا استعفا لکھ کر عدالت میں بھیج دیا۔ اب کیا تھا آزاد ہے اور اپنی مرضی کا مالک اس نے معمولی وکیل کا لباس زیبِ تن کیا اور یہ لفظ کہے:۔

اے میری پیاری بیوی۔ اے مرنے والی جس کی یاد میں میں آجتک ماتمی ہوں۔ لے میں تیرے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں نے اسے معاف کر دیا اور میں اُس کی طرف سے وکالت کرنے کے لئے عدالت کے روبرو جاتا ہوں ٭

عبد القادر

غرناطہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے عروج اور زوال کا ایک وقت مقرر ہے جس طرح یونان کو زوال ہوا جس طرح روما تباہ ہُوا۔ اسی طرح ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں پر زوال آیا۔ سلطنتِ غرناطہ مسلمانوں کی آخری یادگار ہسپانیہ میں باقی رہ گئی تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کا نرغہ تھا۔ مگر واہ رے شجاعت سب کو برابر جواب دیتے رہے۔ آخر یہ ہُوا کہ ابنِ احمر سلطان کے زمانہ میں صرف غرناطہ اور اس کا قرب و جوار مسلمانوں کے قبضہ میں رہ گیا۔

قرطبہ کے عوض اب غرناطہ اسلامی علم و ہنر کا گھر ہُوا۔ اس کی عمارت کی دھوم پڑ گئی خود غرناطہ ایک نہایت خوبصورت شہر تھا۔ شہر کی بلند عمارتوں پر چڑھ کر نظر دوڑائی جاتی تو دُور تک ایک سرسبز و شاداب میدان دکھائی دیتا تھا جس میں ندیاں انگورستان باغات اور نارنج کے جھنڈ نظر آتے تھے، اندلس بھر میں کوئی اور شہر اس وضع اور آب ہُوا کا نہ تھا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں تو سخت سے سخت گرمی میں جاڑے کا لُطف پیدا ہو جاتا تھا۔

قصر الحمرا ایک سطح مرتفع پر قائم ہے جس کے چاروں طرف کھڈ اور نالے ہیں۔ اور شمال کی طرف دامن میں دریائے ڈارو بہتا ہے۔ پتھر کی مضبوط دیواریں چاروں طرف سے قصر کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت سنگین اور مضبوط بُرج کے نیچے قصر کا بیرونی دروازہ ہے جس میں درِ عدالت نصب ہے۔ اس دروازہ میں سُلطان مسندِ عدالت پر بیٹھ کر دادِ انصاف دیتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چوک نظر پڑتا ہے جسکی ایک طرف چارلس پنجم شاہ ہسپانیہ کا تیار کردہ محل نامکمل حالت میں پڑا ہُوا ہے۔ آگے چل کر ایک برآمدہ ملتا ہے جس سے گذر کر صحنِ حنائی میں جا داخل ہوتے ہیں۔ اس صحن میں حنا کے بیشمار پودے ہیں۔ اس کے بعد ایک تنگ راستہ سے نکل کر ایک اور صحن ۱۴۰ فٹ لمبا اور ۷۰ فٹ چوڑا ملتا ہے اس کے عین وسط میں ایک تالاب ہے جس میں سُنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں۔

دھوپ کا عکس جب مچھلیوں اور پانی پر پڑتا ہے تو عجب بہار ہوتی ہے۔ چاروں طرف کونوں پر ستون اور بھول بھلیاں ہیں۔ ہر وقت ایک سکوت کا عالم چھایا رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیوانِ وکلاء میں جاتے ہیں۔ سلاطین بنی اُمیہ اسی دیوان میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے تھے۔ اوپر کا ایک بلند گنبد ہے۔ چاروں طرف عربی خط اور عربی زبان کے کتبے دیواروں پر ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ مناسب مناسب موقعوں پر بیل بوٹے بھی ہیں چھت پر دائرے تاج اور ستارے بنے ہوئے ہیں جس سے گنبد میں گنبدِ نیلوفری کی شان پیدا ہے۔

مینار کی بھول بھلیوں کو طے کر کے ہم مینار کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ یہاں سے میدان ویگا صاف نظر آتا ہے۔ سلطانہ کا کمرہ ان ہی بھول بھلیوں میں ہے جسکی کھڑکیاں میدان ویگا کیطرف ہیں۔ دروازے کے نزدیک ہی سفید سنگ مرمر کے فرش میں متعدد سوراخ نظر آتے ہیں کہتے ہیں کہ اس فرش کے نیچے بخورات جلائے جاتے تھے اور خوشبو سوراخوں سے نکل نکل کر کمرہ کو معطر کرتی تھی۔ نیچے پائیں باغ ہے جس میں ایک مختصر سا چمن ہے۔ اِس کے قریب ہی شاہی حمام ہیں جن پر پچیکاری اور گلکاری کا کام دیکھنے اور تعریف کرنے کے قابل ہے۔ حمام کے بیچوں بیچ حوض ہے جس کا پانی لہروں کے باعث آہستہ آہستہ گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ سامنے اوپر کی طرف بالاخانہ کے طرز کی کھڑکیاں ہیں جن میں حمام کرنے کے وقت نغمہ وسرود سے کام لیا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ مشہور و معروف قصر کا وہ حصّہ ہے جو "بیت الاسد" یا "شیروں کے صحن" سے موسوم ہے ایک سو اٹھائیس سفید سنگ مرمر کے ستون تین تین چار چار کے قطار میں نصب ہیں اُن پر بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں جن کے ستونوں کی خوبی۔ باریک گلکاری کی شان۔ سنہری اور روپہلی رنگ کی بہار۔ تاج نما گنبدوں خوبصورت میناروں اور محرابوں کی دلربایانہ کیفیت۔ شاعرانہ مزاج کے لئے تازیانہ کا کام دیتے ہیں۔ نیچے ایک خالی حوض ہے جس میں بارہ ہیبت ناک شیر کھڑے ہیں۔ اِن کے مونہوں سے کسی زمانہ میں پانی نکل نکل کر حوض کو بھرتا رہتا تھا۔

اس خوبصورت صحن سے آگے بڑھ کر دیوان بنی نصر ہے۔ کہتے ہیں کہ بنی نصر کے سردار اسی جگہ سلطان ابو عبداللہ کے حکم سے تہِ تیغ کئے گئے تھے۔

قصرِ زرتلیعف ایک اور محل ہے جس کو قصر الحمرا کا تابستانی مقام کہنا چاہئے۔ ایک سادہ سا محل ہے۔ دیواریں چبوترے بارہ دریاں اور محرابیں سب کھنڈر پڑے ہیں۔ عربی گلکاری پر سفیدی کی پائدار تہیں ابھی تک قائم ہیں۔ مگر سنگ تراشی کے عجیب دلفریب نمونے ضائع ہو چکے ہیں۔ اور عمارت کی اندرونی خوبی عرصہ ہوا معدوم ہو گئی ہے۔ ہاں باغوں اور نہروں کا لطف ضرور قائم ہے۔ ایک سبک رفتار نہر سنگِ مرمر کی نالی سے ہو کر صحن میں اس طرف سے اُس طرف کو نکلی ہے جس پر نارنج اور سرو کی گھنیری چھاؤں کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ فوارے۔ نلکے۔ نلکیاں چھوٹے چھوٹے پانی کے برتن۔ نہر کے پیچ در پیچ راستے۔ نہروں کے اندر چھوٹی چھوٹی اور نہریں۔ یہ سب اس خوبی اور نفاست کے ساتھ باہم جمع کئے گئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

دو صدیوں تک مسلمانوں نے غرناطہ میں امن چین کے ساتھ حکومت کی۔ مگر آخر کہاں تک۔ شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا کی شادی ہوتے ہی ہسپانیہ کی قوت یکجا مجتمع ہو گئی۔ یہی شگون مسلمانوں کے لئے بُرا ثابت ہوا۔ سلطان ابو الحسن نے اپنی سی بہتیری کوشش کی۔ مسیحیوں کا مقابلہ خوب خوب کیا۔ مگر پھر بھی سارے کے سارے مقبوضات یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ مدینۃ الزہرا کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اور وہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر یہاں تک ہوا کہ آخر غرناطہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ محاصرۂ غرناطہ کے بعد جب مسلمان میدان چھوڑ کر شہر غرناطہ میں پناہ گزیں ہوئے تو در و دیوار سے نالہ و بکا کی آواز بلند تھی۔

خوبصورت غرناطہ حسین غرناطہ! تیرے نارنج اور حنا کی خوشبو بھی اُسی طرح عیش خانوں اور آرامگاہوں کو معطر کرتی ہے۔ بلبل کا نغمہ اب بھی تیرے دلکشا باغوں میں سنائی دیتا ہے۔ تیرے سنگ مرمر کے کشادہ ایوانوں میں اب بھی فواروں اور نہروں کی چہل پہل نظر آتی ہے مگر الحمراء کی جوت اور تیرے بادشاہوں کی شان و شوکت اب کہاں!

نذیر حسین ناشاد

رنگ و بیرنگی

دُنیا میں جتنے رنگ ہیں سب کا ظہور روشنی پر موقوف ہے۔ جتنے زور کی روشنی ہوگی اتنا ہی صاف ہر چیز کا رنگ نظر آئیگا۔ مدھم روشنی میں رنگ بھی ماند معلوم ہوتا ہے اور اندھیرے میں تو نیلا لال زرد کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اس مناسبت سے خیال گذرتا ہے کہ رنگ کو روشنی سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے۔ کسی بیفکرے کے سامنے یہ گفتگو ہو تو چھوٹتے ہی کہیگا "میاں اندھیرے میں تو آدمی کو قلعہ نہیں سوجھتا تم رنگ کو لئے پھرتے ہو" لیکن اگر دُنیا میں سب ایسے ہی آزاد اور عقل کے دشمن پیدا ہوتے تو خدا کی خدائی کبھی ایسی آباد نہ ہوتی کارساز عالم نے دُنیا کا انتظام ایسے اُصول پر رکھا ہے کہ سرسری نگاہ سے دیکھئے تو ہر بات معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جتنا عقل کو دخل دیجے بات میں سے بات نکلتی آتی ہے۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ بات کا دفتر بن جاتا ہے۔ ذرا سی مشابہت یا مخالفت دو چیزوں میں ہونی شرط ہے پھر اُس میں جتنی غور و فکر کی جائے تھوڑی ہے جس قدر جس کے ذہن کی رسائی ہے قدرت کے کرشمے اُسی قدر اُس کو نظر آنے لگتے ہیں۔ فلسفہ طبیعیات کے عالموں نے صدہا عملی و نظری دلائل سے پایۂ ثبوت کو پہونچایا ہے کہ رنگ کوئی مادی شے نہیں بلکہ خود روشنی کا جزو ہے۔ طبیعیات کی کتابوں میں لائیٹ یعنی ضیا یا روشنی کے نام سے ایک باب الگ ہی ہوتا ہے بلکہ اکثر محققین نے کتابیں کی کتابیں اسی مضمون سے پُر کر دی ہیں۔ یہاں روشنی کے چند خواص نہایت اختصار کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں ÷

کسی روشن چیز کی طرف دیکھئے تو اُس میں سے باریک باریک روشنی کے خط جھاڑو کی تیلیوں کی طرح نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اِن خطوں کو شعاع یا کرن کہتے ہیں۔ ایک چیز کی روشنی دوسری چیزوں پر ان شعاعوں ہی کے ذریعے سے پہونچتی ہے۔ شعاعیں جب کسی شئے پر پڑتی ہیں تو کچھ اُس پر سے منعکس ہو کر دوسری چیزوں پر چلی جاتی ہیں کچھ اُسی شے کے اندر جذب ہو جاتی ہیں کچھ اُس کی سطح بیرونی پر پھیل کے رہ جاتی ہیں۔ اور اگر

وہ شئے لطیف و شفاف ہے تو کچھ شعاعیں پار بھی نکل جاتی ہیں اس تقسیم سے باری تعالیٰ کی ظاہری مصلحتیں یہ ہیں۔

۱۔ جہاں روشنی براہ راست نہیں پہنچ سکتی وہاں بھی خاصا اُجالا ہوتا ہے اگر آفتاب کی شعاعیں منعکس ہو کے نہ پہنچیں تو کمرے دالان سائبان میں دن کے وقت بھی اندھیرا گھُپ ہوا کرے۔

۲۔ اگر جذب نہ ہوں تو کوئی چیز بغیر آگ کے اندر رکھے گرم ہی نہ ہو اور وہ بھی فقط بیرونی سطح۔ گلنا۔ جلنا۔ پکنا۔ پگھلنا کچھ بھی نہ ہو۔ نہ بخارات بنیں نہ مینہ برسے۔ جو چیز ایک دفعہ تر ہو جائے وہ کبھی خشک ہونے کا نام نہ لے۔ بارہ مہینے جاڑا ہی رہے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں کو آگ سے بھی خاک اثر نہ ہو۔

۳۔ اگر سب شعاعیں جذب یا منعکس ہو جائیں اور سطح پہ کچھ بھی نہ قائم رہیں تو واقعی دن کو قلعہ نہ دکھائی دے۔ بازار سب پٹ پڑے رہیں اور رستے میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے۔

۴۔ اگر صاف شئے میں سے شعاعیں پار نہ نکلیں تو لمپ لالٹین جھاڑ فانوس سب بیکار۔ کمرے کے کواڑ الماری روشندان وغیرہ میں بھولے سے کوئی شیشے نہ لگائے۔ اوّل تو آفتاب کی روشنی زمین تک پہونچنے ہی کیوں لگی زمین کے اوپر چالیس پچاس میل کے دَل کا خول ہوا اور بخارات وغیرہ کا چڑھا ہُوا ہے۔

یہ چند خاصتیں جو ابھی بیان کی گئیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ نہ آلات کی ضرورت نہ علم کیمیا وطبیعیات کی کچھ ایسی واقفیت درکار ہے بعض خواص ایسے ہیں کہ بغیر کسی مدد اور ذریعے کے نہیں معلوم ہو سکتے۔

کبھی دیکھا ہو گا بچّے جو صابن کے بُلبلے اُٹھاتے ہیں اُن میں طرح طرح کے رنگ معلوم ہوتے ہیں حالانکہ صابن سفید۔ پانی سفید۔ شیشے کے ٹکڑے میں بھی اسی طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ گھر میں پڑی پڑائی کہیں جھاڑ کی قلم مل جائے تو اس میں سے دھوپ کی طرف دیکھئے۔ سات رنگ (لال۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ آبی۔ نیلا۔ بنفشی) صاف دکھائی دینگے آخر یہ رنگ کہاں سے آئے۔ شیشہ اپنی ذات سے سفید۔ اندر سے ٹھوس۔ نہ رنگ

بھرا ہُوا نہ پیپر ویٹ کی طرح بیچ میں تہ دی ہوئی۔ آس پاس کھونٹی الگنی پر رنگ برنگ کے کپڑے نہیں پڑے ہوئے نہ طاقوں میں گلدستے چُنے ہوئے۔ جس چیز کے عکس کا شبہ ہو اُسے ہٹا دیجے پھر دیکھئے تو وہی ساتوں رنگ اور وہی ترتیب۔ قلم پر شبہ ہو تو توڑ کے دیکھ لیجے وہی رنگ اپنی اپنی جگہ پر ہر ٹکڑے میں نظر آئینگے۔ آخر یہ طلسمات کیا ہے۔

اہلِ علم نے بچّوں کے کھلونوں سے ایک بات پاکر غور کرنا شروع کیا۔ ہر پہلو سے دیکھا طرح طرح کے آلات سے تجربہ کیا آخر یہ بات نکلی کہ یہی دھوپ جو ظاہر سفید اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے سات رنگ کی شعاعوں سے مرکّب ہے۔ رہی یہ بات کہ شیشے کے ذریعے سے رنگ دکھائی دیتے ہیں یوں کیوں نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے واسطے ایک اور مسئلہ حل کرنے کی ضرورت ہے جس میں انحراف شعاع کی بحث ہے۔ فی الحال یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ منشور مثلث یعنی تکونے شیشے میں داخل ہو کر ایک ایک رنگ کی شعاعیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

سفیدی میں سب رنگ شامل ہیں اس کی جانچ ایک اور طریقے سے ہو سکتی ہے جسکو عملِ معکوس کہتے ہیں۔ وہی بچّوں کے کھلونوں میں سے پھرکی لے لیجے اور اُس کا رہا سہا رنگ بھی چاقو سے کھرچ کے یا پانی میں بھگو کے چھٹا دیجے پھر اُس کے دور میں اوپر کی طرف سات نقطے ساتوں رنگ کے ایسی ترتیب سے لگا دیجے جیسی شیشے کی قلم میں نظر آتی ہے۔ اِس پھرکی کو پھرانے سے اُن نقطوں کی جگہ ایک لکیر بالکل سفید رنگ کی نظر آئے گی۔ جس کے یہ معنے ہوئے کہ ساتوں رنگ کے ملنے سے سفید رنگ پیدا ہو گیا۔ قلم کے ذریعے سے ثابت ہُوا تھا کہ سفید رنگ میں سات رنگ شامل ہیں۔ پھرکی سے یہ ظاہر ہُوا کہ یہی سات رنگ ملانے سے سفید رنگ بن جاتا ہے۔ اب اس کے مان لینے میں کیا توقف ہے کہ جتنے رنگ ہیں سب کی اصلیت سفیدی ہے۔ ہاں دریافت طلب یہ ہے کہ ہر شئے کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے یہ کہاں سے آتا ہے اور اختلاف کی کیا وجہ ہے۔

ل۵ پیپر ویٹ۔ شیشے کا گلدستہ جو کاغذ دبانے کے واسطے رکھا جاتا ہے۔

محققین کی رائے ہے کہ رنگ کوئی مادی شئے نہیں اور نہ کسی شئے کی ذات میں موجود ہے بلکہ جس رنگ کی شعاعیں سطح پر باقی رہ جاتی ہیں وہی نظر آتی ہیں اُن ہی کو اُس شئے کا رنگ کہتے ہیں۔ نیلے رنگ کی شعاعیں باقی رہ گئیں تو نیلا رنگ معلوم ہوتا ہے سُرخ شعاعیں باقی رہیں تو سُرخ رنگ۔ کئی رنگ کی شعاعیں باقی رہیں تو وہ رنگ معلوم ہوتا ہے جو ان کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر کہ کسی سطح پر کس رنگ کی شعاعین باقی رہجاتی ہیں ایک علیحدہ بحث ہے یہاں اُس کی گنجائش نہیں۔

غرض رنگ کے متعلق سائنس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ فی نفسہ کسی شئے کا کوئی رنگ نہیں۔

۲۔ جتنے رنگ ہیں سب روشنی کی شعاعوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ روشنی کی ذات میں سب رنگ موجود ہیں اور وہ خود سفید یعنی بے رنگ ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر ہے ؎

سارے رنگوں کی ہے بے رنگی میں راہ
ابر گر ہے رنگ بے رنگی ہے ماہ

پہلے مصرعے میں ادّعا ہے کہ سب رنگوں کی جڑ سفیدی یعنی بیرنگی ہے۔ دوسرے مصرعے میں تمثیل ہے کہ ابر میں ماہ سے رنگ آتا ہے۔ حالانکہ ماہ میں بظاہر کوئی رنگ نہیں چاندنی رات میں ہلکا سا ابر ہوتا ہے تو یہ سماں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بادل کا کوئی ٹکڑا چاند پر آجاتا ہے تو اُس کا رنگ نہایت خوشنما نارنجی معلوم ہوتا ہے اور جب ہٹ جاتا ہے تو وہ رنگ نہیں رہتا۔

رنگ کے عام معنی یہی ہیں "پیلا۔ نیلا۔ زرد۔ کبود" اصطلاحاً کثرت و اقسام کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے۔ الوانِ نعمت کے معنے ہیں طرح طرح کے کھانے نہ یہ کہ کسی کھانے کا رنگ نیلا ہے تو کسی کا اودا۔ عجب شوق ہر رنگ رقیبِ سروسامان نکلا۔ یہاں ہر رنگ کے معنے "ہر حال۔ ہر موقع" ہیں نہ کہ تصویر کی رنگ آمیزی۔ اُردو ہی میں نہیں غالباً ہر زبان میں رنگ کے یہ معنے بھی ہونگے۔

تصوّف کی اصطلاح میں رنگ سے مراد کائنات ہے اور ہے بھی مناسب۔ کتنی بیشمار صورتیں اور کیسی ایک دوسرے سے الگ ہیں ہر چیز کا نیا رنگ نیا ڈھنگ۔ ع
ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است۔ بخلاف اس کے ذاتِ باری تعالیٰ تقسیم و تنوّع سے مُبرّا ہے اُسے ذات بیرنگی کہنا موزون ہے۔

بہ ظاہر یہ اصطلاحیں کثرت و وحدت کے اعتبار سے مقرر کی گئی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن[1] اور واجب[2] کا تعلق جیسا ان دو لفظوں سے ادا ہوجاتا ہے۔ دو صفحوں میں بھی بیان نہیں ہوسکتا۔ رنگ اور بیرنگی کا لگاؤ جیسا سائنس سے ثابت ہُوا ہے کچھ ایسا ہی حساب مخلوق اور خالق کا ہے۔ رنگ اور روشنی کا تعلق نظر سے یا منشور مثلث اور پھر کی کے ذریعے سے معلوم ہوجاتا ہے لیکن کائنات اور ذات باری کا تعلق معلوم کرنے کے اور ذریعے ہیں۔ یعنی بجائے نظر کے چشم بصیرت منشورِ مثلث کے عوض قلب سلیم اور پھر کی کے بدلے روحِ مصفّا کی ضرورت ہے۔ جن بزرگوں نے ان آلات کو درست کرلیا ہے اور استعمال کرنا سیکھ لیا ہے اُن کو خالق و مخلوق میں وہی تعلق نظر آتا ہے جو ہمیں رنگ اور روشنی میں۔ جو ہمارا قیاس ہے وہ اُنکا یقین۔ جو ہمارا تصور ہے وہ اُنکی تصدیق۔

اتنا تو ہم کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے دالان کی روشنی درو دیوار سے منعکس ہوکر آتی ہے۔ درو دیوار کی روشنی فرش زمین سے۔ زمین کی روشنی آفتاب سے لیکن آفتاب کا فی حد ذاتہٖ منور ہونا کب ثابت ہے۔ یوں تو ہماری دُنیا بھی سیارات کے باشندوں کو روشن معلوم ہوتی ہے مگر یہاں دوپہر کو ذرا سی آندی آجاتی ہے تو رات ہوجاتی ہے۔

سیارات کا نور آفتاب سے آتا ہے تو آفتاب کا نُور کہیں اور سے آتا ہوگا۔ خواہ براہ راست یا اور اجرام فلکی سے منعکس ہوکر۔ مختصر یہ کہ نور حقیقی کچھ اور ہی ہے۔ اُسی سے زمین و آسمان منور ہیں اور یہ سارا رنگ روپ اُسی کا ہے۔ ہمارا سائنس اُس کی تحقیقات سے قاصر ہے اسلئے اللہ تعالیٰ خود اِس مسئلے کو حل کرکے جامع و مانع الفاظ میں فرماتا ہے "اللہ نُورُ السمٰوٰتِ والارض"

اشرف حسین

[1]۔ ممکن الوجود یعنی مخلوق۔ [2] واجب الوجود یعنی باری تعالیٰ۔

ملکۂ محبّت

آفتاب و ماہتاب کچھ کے کچھ ہو جائیں۔ زمانہ کی رفتار میلوں اور کوسوں آگے بڑھ جائے آسمان کروٹوں پر کروٹیں لے اور زمین چکروں پر چکر کاٹے مگر قانونِ قدرت کے سنگلاخ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں! چاند کی آب و تاب تاروں کی چمک دمک سورج کی طلاع و غروب کی سمتیں جو آج سے ہزار برس پہلے تھیں وہی آج ہیں اور اُس وقت تک اسی طرح رہیں گی جب تک کسی سیارہ کی ٹکر یا صانع حقیقی کا حکم اِن تمام اسباب کا خاتمہ نہ کر دے۔

کائناتِ دہر کے متضاد نتائج حیاتِ انسانی کی مختلف حالتیں انواع و اقسام کے تماشے رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ ہیں اُس انقلاب کا جو عمر کے باقی حصہ میں ہونیوالا ہے اور خبر ہیں اُس وقت کی جب جسد خاکی اِن تغیرات سے بے تعلق ہو گا۔

یہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لئے جائیں تو لاجرم اِس کا صانع ماننا پڑے گا! وہ نیچر ہو یا خدا۔ مگر اس اُستادی کے قائل ہیں کہ باعتبار ضرورت پارس بنا کر بھیجا اور کندن بنا کر چھوڑا! کچھ ایسا دلچسپی کے سانچے میں ڈھالا کہ اِس حیاتِ ناپائدار پر کیسی ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ گذریں آفتوں پر آفتیں آئیں مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹیں چاہو کہ اس پیرزال کی نیرنگیوں سے دل اُکتا جائے ممکن نہیں۔

اِسی منزل گاہِ راحت و عیش میں جہاں باجے گاجے کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ وہاں شہر سے باہر ایک کونہ میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے جس میں ٹوٹی پھوٹی پُرانی قبریں اِن خوشیوں کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں! یہ مٹی ہوئی صورتیں جو آج اس سنسان میدان اور ہو کے عالم میں بیخبر پڑی ہیں کل اسی منزل گاہ میں شاداں و فرحاں پھر رہی تھیں! فارغ البالی کے چتور اُن کے سروں پر سایہ کئے تھے اور حیات مستعار اِن پر راحت و اطمینان کے پھول برسا رہی تھی عزیزو! تعلقات کا

اثر جیسا تم پر ہے ایسا ہی ان پر بھی تھا۔ جس طرح تمہارے دلوں میں ارمان ہیں ان کے بھی تھے! بادِ صبا کی اٹکھیلیاں جس طرح تمہارے ساتھ ہیں اسی طرح ان کے ساتھ بھی تھیں۔ یہی چاند تارے جو آج تمہارے سامنے ہیں ان کے سروں پر بھی تھے! قدرت کی تمام دلچسپیاں جوں کی توں ہیں مگر اس کی بہار دیکھنے والے بدل گئے! یہ نیند کے متوالے جن کے ڈھیر پیشِ نظر ہیں۔ اس فراقِ ابدی سے خوش نہ تھے! جاگ سکیں تو ان کو اٹھاؤ اور ان سے پوچھو کس دل سے گئے اور کس حال میں رہے! بڑی طاقتور تھی وہ چیز جو ان غریبوں کو ایسی چہل پہل سے اٹھا لائی۔ اور اس جنگل بیابان میں لا لٹایا۔ فاختہ کی کُو نے ان نو وارد مہمانوں کو لوری دی۔ اِملی اور نیم کی پتیاں ان کو تھپکنے لگیں! گویا پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں ان کے شکوے شکایت سب ختم ہوئے۔ اور اب ہمیں ان سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں مگر نہیں! کبھی تو ان کی بھی خاطر منظور تھی! زندوں کی ملاقات کا لطف تو بہت اُٹھایا۔ آؤ آج اِن مردوں کی صحبت میں بھی شریک ہوں۔

کیسی بارونق محفل جمی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے بڈھے جوان ایک لباس ایک وضع ایک قطع ننگے سر ننگے پاؤں اپنے اپنے کارناموں پر فخر کر رہے ہیں! بہت سے خلق و محبت کے بندے ہیں جو اپنی بیش بہا زندگی دوسروں پر نثار کر گئے۔ گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ آئے۔ مگر ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ کیسے مستقل مزاج لوگ تھے مصیبتیں جھیلیں آفتیں بھگتیں مفلس جئے قلاش مرے مگر خلوص کے لہلہاتے پھول جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے انہیں نہ مرجھانے دیا! دیکھو اور نظرِ عبرت سے دیکھو! زندگی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ جیتے جی تو ان کی کچھ وقعت نہ تھی مگر آج ان کی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ بڑے بڑے عبادت گزاروں کی ٹکٹکی ان کے چہروں پر بندھی ہوئی ہے اور یہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے! حاصلِ عمر دوسروں کی نظر میں عزت کے خواہاں رہے نہ دولت کے طالب۔ ان کی آرزو۔ ان کے ارمان۔ ان کی خوشیاں ان کی اُمنگیں جو کچھ تھیں یہ تھیں کہ دوستوں کا دم بھرتے پیاروں کا نام لیتے [illegible] ختم ہو جاتی! خوش نصیب تھے یہ آپ اور غنیمت تھی ان کی زندگی!

جنگل بسانے والو! گو ہم سے رخصت ہو گئے اور ایسے رخصت ہوئے کہ اب نظر نہ آؤ گے۔ مگر زینت تھی تو تمہاری۔ اور انسان تھے تو تم۔ یہ چوتھی کی دلہن یہ حسین ملکہ جو آج سنہری کٹہرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہے۔ تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اس کے قدردان کہاں اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس صورت شکل کی عورت ہو گی جس کی قبر پہ یہ کچھ نور برس رہا ہے۔ دو رویہ گملوں کی قطاریں رنگ برنگ کے پھول مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرہانے سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے جس پر کندہ ہے "ملکہ محبت کی آرامگاہ"۔

راشد الخیری

زبان کی تمیز اور اس کا فرق

زبان تو یہی ایک گوشت کی بوٹی ہے جو دانتوں کی چار دیواری میں تالو کی چھت کے نیچے بل مارتی پھرتی ہے۔ کبھی تو ہونٹوں کے پھاٹک میں دڑانہ آکھڑی ہوتی ہے کبھی گردن نکال کر ادھر ادھر کچھوے کی طرح جھانکنے لگتی ہے۔ کبھی میٹھی چیز کا مزا لیتی ہے۔ کبھی کھٹے اور کڑوے سے منہ بناتی ہے۔ کوئی اسے لسان کہتا ہے۔ کوئی جِیب۔ کوئی تیل کہتا ہے۔ کوئی ٹنگ۔ کسی نے نلّو کہہ لیا۔ کسی نے رسنا۔ مگر ہماری مراد اس جگہ روزمرہ کی بول چال یا ہر ملک کی بھاکا سے ہے۔ اس میں خواہ عورتوں کی بولی ہو خواہ مردوں کی گنواروں کی گفتگو ہو یا شہر والوں کی۔ لکھنؤ کی لفت تراشی اور متانت ہو۔ یا دہلی کی سادگی اور سلاست۔ قلعہ معلّیٰ کی معاملہ بندی ہو۔ یا ثقات کی لطیفہ گوئی۔ شہیدوں کا پھکڑ ہو یا آزادوں کی بدلگامی۔ پیشہ وروں کی اصطلاحیں ہوں یا دلالوں کی رمزیں۔ بچوں کا اوں اوں اور مم مم کرنا ہو یا بیگموں کا نت نت اور جم جم کہنا یہ ساری باتیں ہماری اس زبان میں داخل ہیں جس کا ہمیں بیان کرنا منظور ہے۔

عام زبان کسی خاص قوم یا خاص شہر پر مخصوص نہیں ہے۔ یہی زبان ہے کہ جانوروں کے منہ میں ہے اور یہی زبان ہے کہ آدمیوں کے دھن میں۔ اگر بلبل اپنے چہکنے سے خوش

ہے تو کوا بھی اپنی کائیں کائیں میں مگن ہے کوئل کوک کو اچھا جانتی ہے تو مور جھنگارنے کو عمدہ سمجھتا ہے مینڈک ٹرانے میں مست ہے۔ تو جھینگر جھیں جھیں میں پپیہا پی پی سے دل بہلاتا ہے تو فاختہ کُوکُو سے جی خوش کرتی ہے۔ کُتا بھونکنے کو بھلا سمجھتا ہے تو شیر دھاڑنے کو پسند کرتا ہے اونٹ کو بڑانا بھاتا ہے تو بجار کو ڈکرانا پسند ہے غرض ایک دوسرے کی زبان اور لہجہ کو بحیثیت مجموعی ہم بُرا نہیں کہہ سکتے۔ کس لئے کہ ہر ایک کی زبان بجائے خود عمدہ اور بہتر ہے۔ جو فصیح آدمی اپنی زبان سے کام لیتے ہیں۔ وہی غیر فصیح اور جانور بھی کام نکال لیتے ہیں۔

زبان کیا ہے منشائے دلی کے اظہار کرنے کا آلہ ہے۔ ایک زمانہ ہو گا کہ ہم لوگ آنکھوں یا ہاتھوں کے اشارے سے کام لیتے ہونگے۔ پھر ایک زمانہ وہ ہو گا کہ ہم نے صرف اسموں سے کام نکالا ہو گا۔ اب ایک زمانہ یہ ہے کہ ہم نے اسماء افعال روابط وغیرہ کو ملاجلا کر ایک عمدہ تسلسل پیدا کر لیا۔ اور اپنے مفہوم کو اس طرح ادا کرنے لگے۔ کہ سامع کو کسی طرح کی دقت نہ رہی +

اب اگر ہم طاقتور۔ شہ زور۔ اور کسی جنگل یا پہاڑ کے محنت کش باشندے ہونگے تو ہمارا ایک ایک لفظ اور ایک ایک کلمہ جرأت۔ طاقت سختی۔ اکھڑپن۔ غضب۔ خشونت کا جامہ پہنے ہوئے ہو گا حاکم سے بھی بولیں گے تو اکڑ کر ہی بولیں گے۔ اخلاص کی بات بھی کرینگے تو ایسی جیسے پتھر کھینچ مارا۔ اس میں بھی اگر بانگر میں ہماری بود و باش ہو گی تو ہم سب سے زیادہ کرخت لفظ زبان سے نکالیں گے۔ اور جو کھادر میں تو اس سے دوسرے درجہ پر ہمارے الفاظ ہوں گے۔ اور جو ہم دال چپاتی کے کھانے والے نازپروردہ عیش منانے والے ہوں گے۔ اور کبھی ریاضت کے پاس نہ پھٹکے ہونگے تو ہماری بات بات سے مسکینی۔ غربت۔ عاجزی۔ سستی۔ کاہلی۔ ٹپکے گی۔

اوپر کی بحث سے ثابت ہوا کہ کوئی مُلک اور کوئی ولایت کیوں نہ ہو اس میں دو طرح کی زبان اور دو طرح کے الفاظ ہونگے۔ بعض الفاظ میں صرف لہجہ کا فرق ہو گا۔ بعض میں اصلیت کا۔ اس میں سے ایک زبان اکھڑ اور سخت کے نام سے جیسے گنواری یا جفاکش

لوگوں کی بولی کہہ سکتے ہیں مشہور ہوگی۔ دوسری ملائم اور نرم جسے شہری زبان کے نام سے موسوم کرنا بیجا نہ ہوگا تعبیر کی جاے گی۔

تجربہ سے ثابت ہُوا ہے کہ بارہ بارہ کوس فاصلے پر زبان بدل جاتی ہے مگر خاص شہر میں بھی دو طرح کی زبان ہوتی ہے۔ایک عام لوگوں کی جسے متعصب لوگ زبانِ جُہلا یا اونے آدمیوں کی بولی کہتے ہیں۔ دوسری خاص لوگوں کی جسے زبانِ شعراء یا فصحاء کہتے ہیں۔شعرا کی زبان میں بھی اختلاف ہے۔کوئی عام محاورے پسند کرتا ہے کوئی خاص جیسے اُستاد ذوق اور حضرت غالب اب ان شہروں میں بھی فرق ہے۔ جو شہر کسی بادشاہ کا مُدت تک دارالخلافہ رہا ہوگا اُس کی زبان اور شہروں کی نسبت عمدہ اور زیادہ شائستہ خیال کی جائیگی۔

باعتبارِ زبان تو ہر ایک زبان کا مرتبہ ایک ہی ہے مگر اس لحاظ سے کہ دارالسلطنت میں آکر ہر ایک لفظ سانچے میں ڈھلتا اور خیرآد[1] چڑھتا ہے۔اُسے سب پر ترجیح دیسکتے ہیں اِس بات کے ثبوت میں ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔اگر کوئی کشمیر زاد ہندوستان کی زبان کو بُرا بتائے یا کوئی ہندی نژاد اصفہان کی زبان کو ٹکسال باہر ٹھیرائے تو کوئی عقلمند تسلیم کرے گا؟

اب رہی یہ بات کہ زبان کی عمدگی کن باتوں پر منحصر ہے۔سو یہ ہم کیا تمام عالم کھلے خزانے کہہ رہا ہے کہ زبان کی خوبی۔اُس کی سلاست۔عام فہمی۔نرمی۔موزونی چھوٹے چھوٹے الفاظ بڑے بڑے معنی پر موقوف ہے جو لفظ جہاں چسپاں ہو وہیں نگینہ کی طرح جڑا ہو۔ بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کی سمجھ میں آجائے سو یہ بات زیادہ تر عورتوں کی زبان میں پائی جاتی ہے یا اُن لوگوں کی بول چال ہیں جنھوں نے اپنے ماں باپ کی روزمرہ کو معیوب نہ سمجھ کر اُس کے چھوڑ دینے پر کمر نہ باندھی ہو اپنی اصل پر خود بھی قائم ہے ہوں اور زبان کو بھی جوں کا توں بنا رکھا ہو۔اگرچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اوروں کی زبان کی حرف گیری کرتے ہیں۔وہ بھی گھر میں جاکر اپنے بال بچوں کے ساتھ وہ گفتگو نہیں

[1] اصل خرآذ زبان فارسی۔خراط بزبان عربی۔مگر روزمرہ بولچال میں خیراد آتا ہے ۱۲

کرتے جو باہر لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اُن کی تحریریں بھی وہ لفاظی۔ سجع بندی۔ قافیہ پیمائی۔ خود رائی پائی جاتی ہے کہ جسے سُنکر خواہ مخواہ آدمی کی طبیعت اُلجھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کوئی بات بناوٹ۔ اور آورد۔ سے خالی نہیں ہوتی۔ اور اُن کا کلام محض بے لُطف اور بے اثر ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ عربی فارسی کے غیر مستعمل لُغت ٹھونس ٹھونس کر بھر دیتے ہیں۔ اگر کوئی عبارت لکھنے بیٹھے تو دس بیس لغت کی کتابیں آگے رکھ لیں۔ اور اپنی بے معنی علمیت جتانے کو بڑے بڑے لفظ چن کر اس عبارت میں داخل کرتے چلے گئے اور اُس کا نام زبان علمی رکھ لیا۔ عربی لفظوں کو اس طرح بھرا کہ ایک ایک بات کے چار چار مترادف ٹھیرا کر لکھ دئے۔ اُن کی بلا سے کوئی اس سے فایدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے کسی نے اس عبادت کو مجذوب کی بڑ جانا اور کسی نے بلائے جان سمجھا اگر وہ اخبار ہے تو پڑیاں بندھیں۔ اور اگر کتاب ہے تو لڑکوں نے پٹاخے بنائے۔

جس طرح زبان کی خوبی سلاست پر موقوف ہے۔ اسی طرح اس کی تکمیل ہر قسم کے الفاظ کی دستیابی اور کسی طرح کی روک نہ ہونے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنے مُلک کے سخت الفاظ سے پرہیز کریں اور ان کو اپنی زبان پر نہ آنے دیں تو سخت کاموں کے واسطے کہاں سے لفظ لائیں گے۔ اور سخت آلات کا نام کن کن لفظوں سے دھرینگے ایسے لفظوں سے پرہیز کرنا۔ زبان کو آیندہ ترقی سے باز رکھنا ہے۔ ہاں غیر زبان کے اُن لفظوں کا استعمال کرنا جو بالکل ہمارے کانوں سے جُدا زبان سے ناآشنا ہوں۔ کسی طرح کارآمد نہ ہوگا۔ بلکہ اگر وہ لفظ ہمارے قواعد اور لہجے کے موافق ڈھلے جائیں گے تو بھی پُورا پُورا مطلب نکالنے پر قادر نہ ہونگے۔ مگر پچھلی صورت جبتک اپنی زبان سے کوئی لفظ بنایا جائے۔ اور اس کی کامل ترقی ہو کام نکالنے کے لئے اچھی ہے۔ پہلی صورت کے مصداق ہمارے ہندوستان میں اُس شہر کے لوگ ہیں۔ جہاں کے لوگ جہاں تک جن کو آٹھ پہر اُن لوگوں سے کام پڑتا ہے۔ اپنے آقا کی بولی نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی زبان پر عربی فارسی کے وہ لفظ چڑھے ہوئے ہیں جو شاید امیروں کے سوا اور لوگ لکھنے میں بھی مستعمل نہ کرتے ہوں گے۔ اور وہ بھی لکھتے ہونگے تو لغت

سامنے رکھ کر۔

پرانی زبانوں کو جو تنزل ہوتا ہے۔ اُس کا بڑا سبب یہی ہے کہ غیر مانوس الفاظ کا رواج پانا۔ دوسرے ملک کے ایسے لفظوں کو جن کا ثانی اپنے ملک میں موجود ہو۔ داخلِ زبان کرنا۔ سخت سخت مخارج کے لفظوں کو محض اپنی زبان پر چڑھانا عام لوگوں کی زبان کو پابند اختیار سے کرنا۔ سہل المخرج لفظوں کو خیال میں نہ لانا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ اور بھی ایسے ہی باعث ہوتے ہیں کہ جہاں کوئی کرخت اور سخت لفظ لوگوں کی زبان سے نہ نکلا یا تو اُس کو بالکل ترک کر دیا۔ یا کچھ سے کچھ کر لیا۔ اور زبان کے آسان لفظ دیکھ کر اپنی زبان میں ملا لئے۔ سخت زبان صرف کتابوں ہی میں دھری رہ گئی۔

ایک زمانہ ہو گا کہ تمام ہندوستان میں سنسکرت پھیلی ہوئی تھی کچھ عرصہ بعد اُس سے ملتی جلتی ایک اور زبان بولی جانے لگی۔ اُس کے بعد پراکرت کا جھنڈا قائم ہوا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پالی کا اور پھر اُردو زبان کا رواج ہو گیا۔ اور قدیم زبان ایسی گم ہو گئی جیسے عنقا۔ البتہ سنسکرت کے وہ الفاظ جو ہماری زبان سے آسانی کے ساتھ نکل سکتے تھے۔ آجتک جوں کے توں قائم ہیں۔ اور جو الفاظ اِس زمانے کے پنڈتوں کے سوا اور لوگوں کی زبان سے صاف ادا نہیں ہو سکتے تھے یا تو وہ صرف کتابوں میں ہیں یا انہوں نے کوئی صورت قبول کر لی ہے۔ یعنی کہیں سے کوئی حرف گرا دیا۔ کہیں کسی حرف کو کسی حرف سے بدل دیا۔ اور اپنا مطلب نکال لیا۔

ایک ہی ملک میں ایک زبان کے ہوتے جو دوسری زبان کا رواج ہو جاتا ہے اس کا سبب اکثر یہی ہوتا ہے کہ پہلی زبان اپنی سختی کے باعث ناگوار گذرنے لگتی ہے دیکھو سنسکرت کے زمانے میں پالی اور پراکرت نے اپنا جھنڈا گاڑ ہی دیا۔ ژند و پاژند کے وقت میں دری کا نقشہ جم ہی گیا۔ عبرانی کے وقت میں عربی نکل ہی آئی اسی طرح ہر ایک ملک میں ہوتا آیا ہے۔ اور اکثر سخت زبانوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

سید احمد دہلوی۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ

"مجھے دیکھا کیوں"

(ایک ہندوستانی مغنیہ کی طرف سے)

آہ! یہ نظریں! بس لکھنے والے سے خدا ہی سمجھے۔ اس سے تو میں اندھی ہوتی کہ نہ کوئی صاحب میری نگاہوں پر فریفتہ ہوتے اور نہ یوں بھگو بھگو کر لگاتے۔ شکوہ شکایت تو آگے چل کر ہوگی۔ جناب پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ نے "مجھے دیکھا کیوں"۔ یہ وعظ و نصیحت منظور تھا تو آپ نے اس طرف کا رُخ ہی کیوں کیا۔ پھر پوچھتی ہوں۔ منت سے پوچھتی ہوں کہ آپ نے "مجھے دیکھا کیوں"۔ کاش مجھے یہ اختیار حاصل ہوتا کہ پوچھتی آپ نے مجھے دیکھا کیوں"۔ شاید مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپ نے میری آنکھوں کو دیکھا اور تعریف کی مگر صدمہ تو اِس بات کا ہے کہ آپ نے میرا دل نہ دیکھا۔ اُس کے زخم نہ دیکھے اُس کا جنازہ نہ دیکھا۔ اُس کی بے نشان قبر نہ دیکھی۔ اور تو اور اُس کے دوامی عرس کا جو زندہ اشتہار اِن کالی کلوٹی آنکھوں میں تھا۔ اُسے بھی نہ دیکھا۔ حیف! حیف!

جی ہاں! "شبہائے عشق کی بقیہ مسرت مخمور سے تھکی ہوئی نظریں" سبحان اللہ۔ کس قدر اچھا کہا ہے! پھر فرمایئے گا؟ "مسرت مخمور" اِس خوشی کا نشہ کہ چند بیدرد نکتہ چین آوارہ مزاج۔ خدائی خوار "زر میخورم" کی ضرورت ہے۔ "آیئے!" "بیٹھئے" "خوب!" "بہت خوب" "سُبحان اللہ۔ "واہ واہ" "کہیں؟ مجھ بدنصیب کی خوشی اور وہ بھی مخمور کردینے والی خوشی کا اندازہ کس قدر صحیح کیا گیا ہے! بس مجھے کچھ اور کہنا نہیں بھر پائے۔

"میری سیاہ آنکھوں کی سوزاں ظلمتوں میں ایک مبہم اشارہ دعوت پایا"۔ ٹھیک پایا۔ میں بلاتی تھی کہ کوئی آئے اور میری بیکسی کو دیکھے میری بے بسی پر رحم کھائے۔ میرے زخم جگر پر مرہم لگائے۔ مجھے اِس قعرِ بدنامی سے جو عورت کیلئے موت سے بدتر ہے نکالے ذرا سا سہارا ہی دیدے۔

مگر میری تقدیر دیکھنے والے کی روح ہمدردی سے بیچین ہونے کے بدلے "حرص سے لرزنے لگی"۔ اور طرّہ یہ کہ یہ بھی میرا ہی قصور ہے سچی بات آدھی لڑائی ہوتی ہے۔ میں بھی لڑتی۔ مگر چُپ ہوں۔ اور دل کو مار لیتی ہوں۔ کہ جی ہاں میرا "لطف خریدا جاسکتا ہے" اور اِسی سبب سے دیکھنے والے کا سارا شوق بُجھ جاتا ہے۔ میری بے "ہیجانی" بے حرارتی۔ "بے محبتی" اسے زائل کر دیتی ہے۔ بجھا دیتی ہے"

اسے بھی جانے دیجئے۔ غضب تو یہ ہے مجھے بالکل مردہ سمجھ لیا۔ میرا "اظہارِ شوق جھوٹا" "میرا گلے ملنا پُر استکراہ" "میرے بوسے جھکے ہوئے اور سُست" پیارے دیکھنے والے برائے خدا وہ پیار گالیا اور دیکھو۔ کوئی ارمان باقی نہ رہجائے فرمایئے۔ "تیرا مرنا شعبدہ روحانی۔ تیرا جینا ایک خالی مچان۔ تیری قیر ہاتھی پکڑنے کا گڑھا۔ تیرا حشر نشر۔ بیروپئے کا سانگ۔

افسوس!! افسوس!!۔ مُدّت بعد ایک شخص ملا۔ مگر رازِ دل سے ناآشنا!

لائق یلدرم بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر مایوسی کہتی ہے۔ صبر کر خاموش ہو جا۔ کیوں کہ آپ اس قدر بیزار ہوئے کہ ذرا سی دیر میں دُور دُور کرنے لگے میں بھی مردود۔ میری آواز بھی مردود۔ میرا لطف کا شوالہ بھی مردود۔ اور میرے ساتھ موسیقی اور شاعری سب مردود۔ بڑے سنگ دل ہو!۔ شاید یلدرم کے معنے ہی سنگدل کے ہوں۔ اچھا اسے کل یلدرم۔ آج سے میں ہر سنگدل مرد کو یلدرم کہا کروں گی۔ سنو۔ گوش ہوش سے سنو۔ کہ میں کون ہوں۔ میری حالت کیا ہے اور کس کس کی گردن پر میرا خون ہے۔ پہلا گناہ میں نے یہ کیا کہ عورت بن کر دُنیا میں آئی۔ بدظنی کا آماجگاہ بنی۔ رقابتوں کا مرکز ٹھرائی گئی یہ سب میرا قصور ہے۔ مرد کا اس میں بالکل قصور نہیں ہے! بد صورت ہوتی تو بھی نیک سیرت مرد۔ زندہ درگور کرتے۔ اب جو خیر ذرا اچھا آدمیوں میں بیٹھنے کے قابل ہوں تو میری کیا کیا ہجو کیجاتی ہے۔ نظریں تو نظریں لگے تھے اور بوس و کنار تک کے شعلے بجھ جاتے ہیں۔ گانا نہ سیکھتی کہ نہ مقبول ہوتی اور نہ مردوں میں بلائی جاتی۔ اگر کیا میں نے اپنے شوق سے ایسا کیا؟

کیا مردوں کے دلی جذبات کی طلب صادق نے مجھ میں یہ حس پیدا نہیں کی؟ اے اہلِ دل مردو کیا اسے بھی مَیں اپنا ہی قصور تسلیم کرلوں؟ اوہو مجھے اب اپنا اصلی قصور معلوم ہوگیا عورت بھی ہوتی۔ خوبصورت بھی ہوتی۔ گانا بھی سیکھتی۔ مردوں سے بھی ملتی۔ مگر اپنا دل نکال کر پھینک دیتی۔ مرد تو یہی سمجھتے ہیں!۔

ورنہ میری "بے حرارتی"۔ "بے محبتی" وغیرہ کی کیوں شکایت ہوتی بات یہ ہے۔ کہ سب سے زیادہ ظلم عورت پر اور اُس کی غنائی ہستی پر تقدس نما لوگوں کی طرف سے ہُوا انہوں نے خدا کا تو یقین کیا۔ مگر خدا کے بعد جیسا کہ حق تھا۔ عورت کا یقین نہ کیا۔ اکثروں کو بند کر کے اُن کی زندگی بے سُری کردی۔ اور اُن کے اور علم موسیقی کے درمیان ایک ایسا وزنی اور موٹا پردہ حائل کردیا۔ جو نہ اُٹھائے سے اُٹھے نہ پھاڑے سے پھٹے۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج مَیں ہوں۔ اور میرا بدنام فرقہ ہے۔ ہمارے کلیجے ہیں اور یلدرموں کے تیر۔

ہم بھی انسان تھے۔ ہم بھی دل رکھتے تھے۔ ہمیں یوں بارہ "پھتر باہر" نہ کیا جاتا تو ہم بھی گھروں کی بستی ہوتے۔ مردوں کے غمگسار ہوتے ہم میں بے حرارتی۔ اور بے محبتی" نہ ہوتی۔ ہمارا اظہار شوق جھوٹا نہ ہوتا حیف اب ہمیں لوگ دیکھتے ہیں تو کس کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُس وقت دیکھتے تو ضرور یوں دیکھتے ؎

دیکھنے کا تو مزہ یہ ہے سراپا دیکھے
دیکھ کر پاؤں ترا مونہہ نہ کسی کا دیکھے

دیکھو مسٹر یلدرم۔ ایک نصیحت میری مانو کہ آج سے کسی مغنیہ کو نہ دیکھنا اور یہ سزا اِس قصور کی ہے کہ آپ نے مجھے دیکھا کیوں"

بقلم "نسائی"

اطالیہ

اٹلی کے حالات کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ مضمون ہمارے مکرم لالہ لاجپت رائے صاحب

وکیل چیف کورٹ پنجاب نے عنایت کیا ہے صاحب موصوف اِن دنوں بحیثیت کانگرس ڈپوٹیشن کے ممبر ہونے کے یورپ میں تشریف رکھتے ہیں اور سرزمین اٹلی کی اُنھوں نے انگلستان جاتے ہوئے زیارت کی ہے انہیں اس مُلک کے تاریخی حالات کا عرصے سے شوق ہے چنانچہ انہوں نے نامورانِ اٹلی میں دو کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اس لئے اٹلی پر مضمون لکھنے اور وہاں کے واقعات سے سبق دینے والے نتائج نکالنے کا انہیں خاص حق ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مضمون نہایت شوق سے پڑھا جائیگا۔

یورپین ممالک میں اگر کوئی ملک ایسا ہے جو آب ہوا اور اپنے باشندوں کے عادات وخصائل میں ہمارے وطن سے بمقابلہ دیگر ممالک کے زیادہ مشابہت رکھتا ہے تو وہ ملک اطالیہ ہے۔ ہندوستان اور اطالیہ کے نقشوں کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ شکل وصورت میں بھی دونو ملک بہت کچھ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان بہت بڑا ہے جس میں آبادی ۳۰ کروڑ کے قریب ہے اور اٹلی بہت چھوٹا ہے جسکی آبادی محض ۳۰ لاکھ کے قریب ہے۔ خالق کائنات نے دونو کو ایسی عالیشان اور ظاہرا ناقابلِ گذر چھتیں عنایت کی ہیں کہ اپنے اپنے برا عظم میں بلندی اور خوبصورتی میں اپنا آپ ہی نظیر ہیں۔ ہندوستان کی چھت تو دُنیا میں سب سے بلند اور لاثانی ہے۔ مگر اطالیہ کی چھت بھی یورپ میں سب سے اونچی اور بے نظیر ہے۔ ہندوستان کو بندھیاچل عین وسط میں مشرق سے مغرب کی جانب چیرتا ہے۔ اطالیہ کو کوہ ایپی نائینس شمالاً جنوباً گذرتا ہُوا دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

علاوہ اِن قدرتی کششوں کے جو ہم کو اطالیہ اور اہل اطالیہ کی طرف کھینچتی ہیں یہ بھی یاد رہے کہ شاید دُنیا میں کسی مُلک نے انسانی تماشا گاہ پر اس قدر کروٹیں نہیں لیں۔ اور اس قدر رنگ نہیں بدلے جیسے اطالیہ نے تاریخی تھیٹر پر جس قسم کے گوناگون سین اطالیہ نے دکھائے اور جیسے رنگارنگ کے پردے اُس نے بدلے ہیں وہ سب اس درجہ پُر سبق اور دلکش ہیں کہ پڑھا لکھا انسان بے اختیار اطالیہ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہ وہ مُلک ہے جس نے دوبار انسانی تاریخ میں ”ملکۂ جہاں“ (کوئین اف دی ورلڈ) کا خطاب

حاصل کیا۔ ایک وقت تھا کہ دُنیا رومن سلطنت کا سکّہ مانتی تھی اور چار دانگ عالم میں رومن رُعب داب رومن تلوار اور رومن حکومت کا زور شور تھا۔ سارا یورپ اور قریباً سارا شرقی ایشیا اور کل شمالی افریقہ اہل روما کے باجگذار تھے۔

اِن علاقوں میں کوئی سپاہ دار نہ تھا جس کو روما کے سپاہیوں نے پچھاڑا نہ ہو۔ کوئی تاجدار نہ تھا جس کو مطیع کر کے سرنگوں نہ کیا ہو۔ رومن شاہنشاہ کے تاج میں اتنے شاہی نگین تھے جو کسی سے شمار نہ ہو سکتے تھے۔ اُس کے چاکروں کی صف میں اتنے حکمران کمربستہ رہتے تھے کہ جنکی گنتی نہ ہو سکتی تھی۔ روم کے تخت پر ایسے بھی بادشاہ بیٹھ چکے ہیں جو گھوڑے پر سواری کرنے کیوقت دیگر مطیع شدہ فرمانروایان کے گردن پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ روما کی سلطنت جمہوری اپنے جوبن پر تھی۔ دنیاوی جاہ حشمت اور سلطنت میں دُور دراز علاقوں پر حکومت کرتی تھی اور اپنی رعایا کی آزادی کی حفاظت اور علم و فضل کی اشاعت و ترقی میں نامور تھی۔ اِس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ سلطنت کے گھمنڈ اور بادشاہت کے زعم اور تہذیب کی شیخی میں جو زیادتیاں روما اور اہل روما نے دوسرے ممالک کے فرمانروایان اور رعایا پر کی تھیں اُن کا خمیازہ اُن کو اُٹھانا پڑا۔

اور باہمی خانہ جنگیوں اور گھر کے جھگڑوں اور لیڈروں کے حسد و نفاق و بغض و کینہ کی سزا پوری پوری بھگتنی پڑی۔ اور جو ابھی تھوڑا عرصہ پہلے زبر تھے وہ زیر ہو گئے۔ اس عرصے میں اطالیہ (روم اطالیہ کا دار الخلافہ ہے) کئی دفعہ لُوٹا گیا۔ اور جلایا گیا۔ سچ پوچھو تو انسانی غرور اور تکبر کی بھی حد ہے۔ جب کسی نے حد سے تجاوز کیا مُنہ کے بل گرا۔ جسوقت اطالیہ اپنے تہذیب کے پروں پر پرواز کر رہا تھا اور دُنیا میں جو ناگفتہ بہ سامان عیش و عشرت میں اُن کی زور دار لہریں بہا دیتا تھا۔ اُسی وقت قدرت نے ایسا تھپیڑا لگایا کہ حضرات روما کو ساری تہذیب اور سارا عیش و طرب بھُول گیا۔ اس کے بعد پھر ایک اور زمانہ آیا جب کہ روما نے ایک نیا بھیس بھرا۔ اور اس دفعہ دنیاوی تہذیب اور دُنیاوی سلطنت کو چھوڑ کر دینی حکومت اور دینی اقتدار کا سوانگ رچا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب روما کا پوپ یورپ کے تخت و تاج بخشنے اور چھین لینے کے

اختیار وسیع رکھتا تھا۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ اُس کے فیصلے کے خلاف چُوں وچرا کرے۔ کسی کو جرأت نہ تھی کہ اُس کی حکم عدولی کرے۔ پوپ کی تحریر گویا تقدیر کا لکھا تھا۔ یورپ کی جملہ سلطنتیں روم کے نام سے کانپتی تھیں۔ سارا یورپ روم کی آواز کے نیچے تھا۔ تمام بادشاہی خزانے اور تمام افواج روم افواج روم کی وضعداری اور اُس کے جلوس کی رونق بڑھانے کیلئے ہر وقت موجود تھیں۔ یہ وہ شان تھی کہ ایک دفعہ تو انسان کا دِل ہلا دیتی تھی۔ یہ وہ اقتدار تھا کہ جس کے سامنے نہ کسی بادشاہ کی مجال تھی اور نہ کسی رعایا کو سر ہلانے کی گنجایش۔ آخر اِس کا بھی انجام آپہنچا اور جرمن میں ایک غریب سے مُلّا (مارٹن لیوتھر) نے جھنجھلا کر اس طرح حضرت پوپ کی عالیشان عمارت کو ہلا دیا کہ بنیادوں تک جنبش کھا گئیں۔ پوپ کے دینی رُعب و داب کا کم ہونا تھا کہ اطالیہ کا پولٹیکل آفتاب بھی مدھم پڑ گیا۔ اور آخری نتیجہ یہ ہُوا کہ اِرد گرد کی طاقتوں نے موقعہ پا کر مُلک کے مختلف حصے دبا لئے اور اپنے اپنے بھائی بندوں کو سَونپ کر ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

ایک چھوٹا سا ملک اور اُس میں کئی شاہی خاندان حکومت کرنے لگے۔ جنوبی حصہ سسلی کا تخت علیحدہ۔ نیپلز کا علیحدہ۔ ٹسکنی کا علیحدہ۔ پیڈمانٹ کا جُدا۔ فلارنس کا جُدا۔ اِن سب کے علاوہ خاص روم میں حضرت پوپ علیحدہ اپنی ڈھائی چاول کی کھچڑی پکاتے رہے۔ طرفہ یہ کہ یہ مختلف حصص مختلف طاقتوں کے زیر سایہ تھے۔ بعض فرانس کے۔ بعض آسٹریا کے بعض اسپین کے اور بعض خود مختار۔ ایسی حالت میں رعایا کی جو حالت ہو سکتی ہے اور ہوئی اُسکے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے ہموطنوں کو اِن سب حالتوں کا اس قدر تجربہ ہے کہ یقیناً اُن کے سامنے اُس ذلّت و نکبت کا نقشہ کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ جو ایسی صورت میں محکوم رعایا کے لاحق حال ہوتی ہے۔ آخر قدرت نے پھر ایک پلٹا دینے کی ضرورت محسوس کی۔ اور اہل مُلک و مختلف فرماں رعایان کے مابین باقاعدہ شطرنج کی بازی جم گئی۔ طرفین سے کِشت پر کشت پڑنے لگیں۔ کئی دفعہ بازی ختم ہونے کو آ گئی مگر آخر حکمران حضرات کو کوئی نہ کوئی راستہ ملتا رہا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ بازی بہت مُدت تک لگی رہی۔ رعایا نے علانیہ خُفیہ مختلف طریقوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بہت

جدوجہد کی۔ اُدھر حکمران فرمانروایان نے اپنی طاقت وحکومت کے برقرار رکھنے میں کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ قریباً ایک صدی تک یہ نقشہ جما رہا۔ مُلک میں کتنی ہی خفیہ سوسائٹیاں قائم ہوگئیں۔ اہل قلم نے اپنی جودت طبع آزاری کے خیالات کی اشاعت میں صرف کی۔ شاعروں نے بھی مُلک کو اُبھارنے اور طبیعتوں کو جوش دینے کے لئے دیگر ہمدردانِ ملک کا ہاتھ بٹایا۔ حتیٰ کہ جون ۱۸۰۵ء میں اطالیہ کے ایک اکڑ کی چاہنی خاتون نے ایک بچہ جنا جسکے ماتھے پر اطالیہ کا اتفاق اور اطالیہ کی آزادی کے نقش پائے گئے۔ یہ شخص جوزف میزینی تھا جس کو اٹالین اتفاق کا پیغمبر اور اٹالین آزادی کا رسول کہا جاتا ہے۔ ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم اس وقت اس شخص کی زندگی کے واقعات قلمبند کریں۔ گو ہمیں یقین ہے کہ وہ حالات نہایت دلچسپ اور پُر معنے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس شخص کی تعلیم وتلقین اور اس کی فنا فی القوم زندگی نے اطالیہ کے پولیٹیکل شطرنج کا نقشہ بدل دیا۔ اس شخص کا جوان ہونا تھا کہ کھیل گرم ہوگیا اور چاروں طرف سے "انقلاب" "انقلاب" کے آوازے آنے لگے۔ چاروں طرف سے زبانی تحریک تحریری کوشش کی امداد میں ہتھیار چلنے شروع ہوگئے۔ یہ تمام کوششیں شاید بارآور نہ ہوتیں اگر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک جوانمرد جس نے میزینی کی شاگردی میں اٹالین اتفاق اٹالین آزادی کی تعلیم پائی تھی۔ اہل اطالیہ کی سرداری کے لئے کھڑا نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ خداوند کریم ہمیشہ ضرورت کے وقت اپنے برگزیدہ بندوں میں سے کسی نہ کسی کو اپنی خلق کی امداد کے لئے بھیجتا رہتا ہے۔ یہ شخص جسنے اپنی تلوار اور اپنی دلیری اور جانبازی سے اہل اطالیہ کے بند کاٹے۔ اور غیر قوم کے حکمران خاندان کو نیچا دکھا کر مُلک سے باہر کر دیا۔ گیری بالڈی تھا جو آج اہل اطالیہ کا سب سے پیارا اور سب سے چاہیتا ہیرو ہے۔ اگر یورپ میں کسی شخص نے تاج اور تخت چھین کر بخش دیئے۔ اور مُلک فتح کر کے دوسرے کو دیدیئے تو وہ گیری بالڈی تھا جسنے شاہ میلان کو اطالیہ بنایا اور سارے مُلک میں قومی حکومت قائم کی۔ انصاف سے بعید ہوگا۔ اگر ہم اس موقعہ پر اُس وزیر باتدبیر کا ذکر خیر نہ کریں۔ جس کی تدبیر ودانائی نے گیری بالڈی کی شجاعت کو پوری کامیابی کا مُنہ دکھایا۔

ہمارا اشارہ کونٹ کیور کی طرف ہے جو شاہ پیڈ ماٹ کا وزیر اعظم تھا اور جس کے تمدن و تدبیر و حکمتِ عملی کا آج سارا یورپ قائل ہے۔ اِس عقلمند بادشاہ (وکٹر ایمونیل) کی دانائی بھی کم سراہنے کے قابل نہیں ہے۔ گو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان چاروں بزرگوں میں سے اول الذکر دو خاص عزت کے قابل ہیں کیونکہ زیادہ تر انقلاب کا بوجھ اُن پر پڑا۔ اُنہوں نے سخت سے سخت مصائب کا مقابلہ کیا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ مدت تک جلاوطن رہے۔ ناگفتنی عذاب اُٹھائے۔ مگر وطن کی محبت اور آزادی کی چاہ میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ آج اٹلی اور اہلِ اٹلی اِن دونوں بزرگانِ قوم کے نام پر فدا ہیں۔ جگہ جگہ اُن کے بُت ایستادہ کیے گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔ جگہ جگہ ان کی یادگاریں بنائی گئیں ہیں اور بنائی جا رہی ہیں۔ شہر شہر میں گلی کوچے۔ چوک اور محلّے بازار اور گذرگاہیں اُن کے نام سے موسوم ہیں۔ روم میں سب سے بلندی پر اور سب سے عمدہ موقعہ پر گیری بالڈی کا بُت ہے جس کو اُستاد نے اسی طرح نصب کیا ہے کہ مرحوم جنرل کی نظر ہمیشہ پوپ کے محلات کی طرف رہتی ہے۔ جس سے کاریگر نے یہ ظاہر کیا کہ جب تک اہلِ مُلک پوپ کے محلات پر قابو نہیں پاتے اُن کو پورا امن نصیب نہیں ہو سکتا۔

میلان میں جو اٹلی کے آزاد ہونے سے پہلے شاہ وکٹر ایمونیل کا دارالسلطنت تھا کیور کا بُت ہے۔

اٹلی میں روم۔ نیپلیز۔ میلان۔ جنوا اور فلارنس قابل دید شہر ہیں۔ اوّل الذکر شہر دارالخلافہ ہے۔ اس شہر میں ایک حصہ جس میں پوپ کے محلات واقع ہیں۔ پوپ کے تسلط میں ہے اور اِس حصے میں پوپ کو اختیارات کامل حاصل ہیں گویا ایک شہر میں دو بادشاہیاں ہیں۔ اِس حصے میں سینٹ پیٹر کا گرجا ہے جو ایک قدیم بُت خانے کی جگہ پر بنایا گیا ہے۔ اِس گرجے کے سامنے دو بُت ایستادہ ہیں جن میں سے ایک سینٹ پیٹر کا اور دوسرا سینٹ پال کا ہے۔ اوّل الذکر کے ہاتھ میں بہشت کی کنجی ہے اور آخر الذکر کے ہاتھ میں دین کی تلوار ہے۔ رُوم میں بہت بڑے بڑے عالیشان گرجے ہیں مگر سینٹ پیٹر کا گرجا خاص پوپ کا گرجا ہے اور اپنی شان۔ آراستگی اور خوبصورتی میں دُنیا میں لاثانی ہے۔ پوپ کا مذہب کسی طرح بُت پرستوں سے مختلف نہیں ہے۔ اِن گرجاؤں میں حضرتِ عیسیٰ۔ اُن کی

والدہ مریم کے بُت اور حواریوں۔ ولیوں اور شہیدوں کی قبریں اور اُن کے بُت پوجے جاتے ہیں۔ اور اُن پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں۔ چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ دھوپ جلائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے گرجے سابقہ مندروں کو گرا کر بنائے گئے ہیں۔ پُرانے بُت توڑ کر عیسائی تصاویر اور عیسائی بُت رکھ دیئے گئے ہیں۔ اِس شہر کا ہر ایک حصّہ انسان کے لئے عبرت سے بھرا ہُوا ہے۔ قدیم سلطنت روما کے آثار صنادید قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلوں تک زیر زمین مکانات۔ قبریں اور پُرانے محل کھودے جا رہے ہیں اور پُرانی عظمت اور تہذیب اور شان کو یاد دلا رہے ہیں۔ ان تہ زمین کھنڈرات میں جا کر بے اختیار خدا کی خدائی یاد آتی ہے اور سخت سے سخت منکرِ خدا کو بھی ایک پروردگار کی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اِن کھنڈرات میں عیسائی پادری چراغوں کی روشنی میں لوگوں کو ابتدائی زمانہ کے عیسائیوں کے مکانات اِن کی قبریں اور اُن کی عبادت گاہیں دکھاتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ لوگ اپنے دین کی حفاظت میں اور اپنے ایمان کی خاطر شہید ہوئے۔ ہائے افسوس! ہر نئی عمارت کا بنانے والا یہ بھُول جاتا ہے کہ اُس کی اپنی بنائی ہوئی عمارت کتنے بندگانِ خدا کی نعشوں پر کھڑی ہے۔ اور کتنوں کے خون سے تعمیر کی گئی ہے۔ اور جن باتوں کا وہ دوسروں کو جابدہ ٹھہراتا ہے وہ اس سے خود بھی کس حد تک سرزد ہوئی ہیں +

اٹلی میں دو زبردست آتش خیز پہاڑ ہیں۔ کوہ اٹنا اور کوہ وسیوویس یہ دونوں خونخوار پہاڑ وقتاً فوقتاً اہل روما کے زعم کو توڑتے رہے ہیں۔ دو ہزار برس کے قریب عرصہ گذرا جب سلطنت روم اور رومن تہذیب اپنے جوبن پر تھیں اس وقت ویسوویس نے خدا کے غضب کی شکل اختیار کی اور اٹلی کے ایک نہایت عظیم الشان شہر کو اپنی راکھ کے نیچے دفن کر دیا۔ لوگ بستروں سے اُٹھنے نہیں پائے تھے کہ شعلوں سے دب کر فنا ہو گئے۔ یہ مقام اب کھودا جا رہا ہے اور اُس میں سے عالیشان مکانات کے کھنڈرات۔ بُت۔ مندر۔ سرکاری عمارتیں اور دیگر مختلف سامانِ معاشرت و تہذیب نکل رہے ہیں۔
اِن کھنڈرات میں سے بعض نعشیں۔ ایسی ملی ہیں جن کا جسم گو پتھرا گیا ہے مگر جن کے

دانت اور ہڈیاں بجنسہٖ اصل شکل میں اب تک موجود ہیں۔

ایک موقعہ پر ایک ماں بیٹی سوئی ہوئی نکلیں۔ ایک دوسرے موقعہ پر عاشق اور معشوق ہمکنار نکلے۔ بہت سے جانوروں کے پنجر نکلے۔ ان کھنڈرات کو دیکھنے سے اور اُن میں سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں اُن ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے کی تہذیب پر اُس زمانے کے لوگوں کا ناز کرنا کیسا فضول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں تہذیب ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ سے رہے گی۔ صرف تفاوت اس قدر ہے کہ یہ درخت جگہ بدلتا رہتا ہے۔

لاجپت رائے

کالر ٹائی

ایک بزرگ جو انگریزی لباس کے مخالف تھے۔ اس کی مذمت کرتے ہوئے ایک دن فرمانے لگے "صاحب! اور سب باتیں تو پھر بھی کچھ سمجھ میں آئیں مگر نہ آئی تو یہ کالر ٹائی۔ ایک پٹہ سا گلے میں باندلیا اور ایک رنگین چیتھڑا اس کے اوپر لپیٹ لیا۔ اور لگے اترا اترا کے چلنے۔ کونسی خوبی اس میں ہے کہ انسان ہر وقت کا ایک عذاب مول لے۔ ہم اگر یہ پٹہ پہنیں تو ہماری گردن اکڑ جائے۔ اوّل تو اس میں خوبصورتی ہی کونسی ہے، اور اگر ہو بھی تو ایسی خوبصورتی کو کیا کریں جو وبالِ جان بن جائے"

نئی وضع کے چند حامی بھی پاس بیٹھے تھے اُنھوں نے مقابلے میں آستینیں چڑھائیں اور کالر ٹائی کی خوبیاں گنوانے لگے۔ معترض ایک تھے اور جواب دینے والے تین چار۔ مگر بوڑھوں کی ہمت کا کیا کہنا۔ بڑے میاں سب کا برابر جواب دیتے رہے اور آخر اگر جیت کر نہیں اُٹھے تو ہار کر بھی نہیں نکلے۔ برابر کا جوڑ رہا اور وہ خود تو یہی کہتے ہوئے گئے کہ یہ بھگوڑے ہمارے سامنے کیا ٹھہرینگے۔ ان کے اچھّوں کو بھی بھگا کے چھوڑ چکے بڑے آئے وہاں سے کالر باند ٹائی خاں بن کے ہیں ان کو کیا گانٹھتا ہوں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگر یہ اپنی حرکات سے باز آجائیں ورنہ وہ ذلیل کروں گا کہ یاد رکھیں۔

بڑے میاں اور اِن نوجوانوں کا مُباحثہ بہت دلچسپ تھا۔ اِس لئے جتنا یاد رہ گیا قلم بند کر لیا گیا۔ ممکن ہے کسی زمانہ میں جب کالر اور ٹائی بحث کی حد سے نکل چکیں اور ہندوستانی انہیں رد یا قبول کر چکیں لوگ اس کو شوق سے پڑھیں۔ چونکہ بڑے میاں وضع قدیم کی حمایت کرتے تھے اور نوجوان طرزِ جدید کے طرفدار تھے اس لئے سہولت کے لئے ہم ایک فریق کو قدیم اور دوسرے کو جدید کہیں گے۔ بڑے میاں کے مُنہ سے کالر کے لئے پٹہ کا لفظ نکلنا ہی تھا کہ طرز نو کے دلدادہ بول اُٹھے۔

جدید۔ یار ذرا تہذیب سے گفتگو کیجئے۔ ہم آپ کو بزرگ سمجھ کر آپ کا لحاظ کرتے ہیں اور آپ کی وضع قطع پر اعتراض نہیں کرتے۔ واللہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ آپ کے لباس کے ہر حصے پر سو سو پھبتیاں ہو سکتی ہیں۔

قدیم۔ آپ کے ہاں خدا جانے تہذیب کسے کہتے ہیں۔ مَیں آپ کی تہذیب کا قائل نہیں۔ مَیں نے تو ایک بجا اعتراض کیا ہے۔ جو سفید سا پٹہ آپ پہنے ہوئے ہیں اسے پٹہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ مَیں تو صاف سچا آدمی ہوں جو آنکھ سے دیکھتا ہوں سو زبان سے کہتا ہوں۔

جدید۔ تو آپنے کالر فرما دیا ہوتا۔ اِسے پٹہ کہنا تو لڑائی مول لینا ہے۔

قدیم۔ مجھے اول تو آپ کے انگریزی الفاظ آتے کم ہیں دوسرے مجھے اِن سے نفرت ہے۔ میری زبان تو وہی زبان ہے جو میرے باپ دادا کی تھی آپ کی طرح نہیں کہ زبان تک بھی آمیزشِ غیر سے پاک نہیں۔ آپ ہی فرمایئے کہ مَیں نے کیا بُرا کیا۔ اگر کالر کی بجائے اپنی زبان کا لفظ بول دیا۔ جب آپ پٹے کے پہننے سے نہیں گھبراتے تو اُس کا نام سُننے سے کیوں گھبراتے ہیں

جدید۔ دیکھئے پھر وہی بات۔ آپ کی چھیڑ کی عادت نہیں جاتی۔ ہم کچھ کہہ بیٹھے تو بُرے بنیں گے۔ پٹہ کُتوں کے گلے میں ہوتا ہے کہ انسانوں کے۔ چونکہ یہ لفظ عام طور پر اُنہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اِس مفید اور کار آمد چیز کو جو مہذب انسانوں کے لباس کا جزو بن گئی ہے۔ اُردو میں بھی کالر ہی کہتے ہیں۔ جہاں ریل

ٹکٹ، لمپ، کمپ وغیرہ سینکڑوں الفاظ انگریزی سے آکر اردو میں شامل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح یہ ہے بمعمولی سے معمولی دو کاندار بھی جانتا ہے کہ کالر کسے کہتے ہیں اور پڑھے لکھے آدمی تو سب سمجھتے ہیں ایک آپ ہیں کہ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہیں۔

قدیم۔ مَیں تو جان کر انجان نہیں بنتا۔ نہیں جانتا جبھی تو پوچھتا ہوں کہ اس "پٹہ" آپ خفا نہ ہو جیئے "کالر" کے پہننے سے کیا فائدہ ہے۔

جدید۔ ہاں یہ ہم آپ کو بتا سکتے ہیں آپ ذرا غور کریں تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے کہ کالر کیسی کام کی چیز ہے۔ اس کے پہننے سے کوٹ کی حفاظت مقصود ہے۔ آپ اپنے چوغے کو تو دیکھیئے گلے کے قریب۔ کیسے میلا ہو رہا ہے اور کتنا بدنما بن گیا ہے۔ ہمارے کوٹ کالر کی بدولت صاف رہتے ہیں۔ علاوہ اس کے کتنا خوشنما ہوتا ہے اور چہرے کو کس قدر رُعب دار بناتا ہے۔

قدیم۔ رُعب کی بھی ایک ہی کہی۔ رُعب جیسا ہمارے اپنے لباس میں ہے۔ وہ آپ کے لباس میں کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک دلیل کوٹ کو صاف رکھنے کی آپ نے دی ہے۔ اس کے جواب میں مَیں کئی دلائل خلاف دے سکتا ہوں۔

(۱) پہننے میں تکلیف۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ لوگ اکثر آئینے کے سامنے کھڑے دیر تک "کالر" سے کشتی لڑا کرتے ہیں۔ (۲) کالر ہر روز یا دوسرے دن بدلنے میں زاید مصارف کا بوجھ پڑتا ہے۔ (۳) گلے کے گرد ایک طوق سا باندھے رہنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ سزا دینا ہے۔

جدید۔ دیکھیئے! آپ کی زبان پھر بے لگام ہوئی۔ آپ سے کوئی شریف آدمی کیا بحث کر سکتا ہے۔ آپ بغیر بُرے استعاروں کے بیجا استعمال کرنے کے بات ہی نہیں کیا کر سکتے "طوق" کہنے والے آپ کون ہوتے ہیں طوق ہو گا آپ کے گلے میں۔

قدیم۔ خدا جانے آجکل کے صاحبزادے نازک مزاج کتنے ہو گئے ہیں۔ ذرا سی بات پر جامے سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔ مَیں نے تو اب دانستہ چھیڑ نہ کی تھی۔ یُونہی بیساختہ طوق کا لفظ مُنہ سے نِکل گیا۔ میرا مطلب طوقِ لعنت سے تو تھا نہیں جو آپ نے سمجھ لیا ہے

مگر اب جو تم کھلواتے ہو تو صاف کیوں نہ کہہ دوں۔ میں اسے طوقِ غلامی تو ضرور سمجھتا ہوں۔

جدید۔ خدا کی شان۔ آپ بھی ہمیں غلامی کے طعنے دینے کے لائق ہو گئے آپ کی عمر غلامی میں گذری۔ پہلے آپ ایک ریاست کی غلامی کرتے رہے اب وہاں سے آئے تو ہر حاکم کی غلامی کرتے ہیں۔ اِس پر آپ کی بسر اوقات ہے۔ صبح ہوئی اور آپ کسی نہ کسی حاکم کے دروازے پر موجود اس کو وسیلہ عزت و آبرو بنا رکھا ہے اس پر یہ حوصلہ کہ ہم جیسے آزاد منش لوگوں کو غلام کہو۔ ہم نے جو تعلیم پائی ہے وہ غلامی کی نہیں آزادی کی تعلیم ہے۔ ہم نہ کسی حاکم کے ہاں جاتے ہیں نہ محکوم کے ہاں۔ ہم نے اسی لئے سرکاری ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ کہ اس میں آپ کی طرح غلامی نہ کرنی پڑے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں آزادی ہاتھ سے نہ جائے چاہے کھانے کو ساری کی جگہ آدھی ہی ملے۔

قدیم۔ زیادہ شیخی نہ بگھاریئے۔ مجھے آپ کی حقیقت خوب معلوم ہے جسے آپ نے آزادی سمجھ رکھا ہے وہ تو ناتجربہ کاروں کی آزادی ہے۔ جو شیخی میں آکر اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آزاد ہیں حالانکہ سخت پابند ہیں۔ کالر لیوں ہو اور ٹائی یوں۔ دوسروں کے رسم ورواج کی یہ پابندی اور اس پر آزادی کے دعوے۔ آزاد ہم ہیں کہ خوشامد سے کام بھی نکال لیتے ہیں اور اس پر طرزِ بود و باش میں اور خیالات ہی میں غیروں کے محکوم اور پیرو نہیں آپ لوگ آزادی کے جھوٹے دعویدار ہیں اور ہم فی الحقیقت آزاد۔

جدید۔ اِس پابندی کا کیا ہے ہم اگر نئے رواج کے پابند ہیں تو آپ پرانے کے۔ بلکہ ہم نے آزادی سے کام لیا پرانے رواج کو بدل دیا۔ آپ اس کے اس قدر محکوم ہیں کہ آپ کو جرأت نہیں کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں۔ مگر یہ سب بحث تو دور از کار ہے۔ ہم نے آپ کو کالر کے استعمال کے فوائد بتائے۔ آپ سے جب جواب بن نہ پڑا تو آپ گالیاں دینے لگے۔

قدیم۔ گالیاں دینا اپنا دستور نہیں آپ کا ہو تو ہو ہاں دب کے کبھی کسی سے رہے نہیں۔ جواب تُرکی بہ تُرکی دینا جانتے ہیں۔ کج بحثی تو آپ نے شروع کی کہ کالر کے فوائد سے غلامی اور آزادی کی بحث میں جا پڑے۔ مگر یہ فرمایئے کہ کالر کا تو کچھ آپ بتا بھی سکے اِس ٹائی کا کیا جواب پیدا کرو گے۔

جدید۔ اِس کا نہایت معقول جواب ہمارے پاس ہے۔ بشرطیکہ آپ اِسے سمجھ سکیں۔ دُنیا میں ایک چیز ہے۔ جسے "حُسن" کہتے ہیں۔ فطرتِ انسان اِس کی ہر جگہ متلاشی رہتی ہے۔ آپ اسے نہایت محدود معنوں میں لیتے ہیں۔ ہم نہایت وسیع معنوں میں۔ ٹائی کالر کا حُسن دو بالا کرتی ہے۔ کالر کے بٹن کو چھُپاتی اور سارے لباس کی زینت کا باعث ہوتی ہے۔ کالر ہو اور گلے پر سے کھُلا ہُوا کوٹ ہو تو ٹائی پہننا ضرور ہے۔

قدیم۔ گویا آپ اسے ایک بے ضرورت چیز مانتے ہیں جو صرف زینت کے لئے لگائی جاتی ہے۔ اوّل تو مردوں کو زینت سے کیا کام۔ یہ عورتوں کا حِصّہ ہے اور دوسرے کس قدر صرف بیجا اس پر کیا جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ گلے سے کھُلے ہوئے کوٹ کیواسطے ٹائی ضروری ہے۔ میں کہتا ہوں ٹائی کی خاطر گلے سے کھُلا ہُوا کوٹ ایجاد کیا گیا ہے ورنہ ہر طرح سے اِس کا بند رہنا مفید تھا۔ اہلِ یورپ یوں تو مردانہ لباس میں سادگی کے دعویدار ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو اُنہوں نے اسمیں اتنے تکلفات بڑھائے ہیں اور اسراف کے اس قدر دروازے کھول دیئے ہیں۔ کہ کوئی حد نہیں۔ میرے خیال میں کالر ٹائی سب فضول خرچی اور تضیعِ اوقات کے بہانے ہیں۔ آپ نے کہا ہے کالر کوٹ کو بچانے کے لئے پہنا جاتا ہے اور ٹائی کالر کا بٹن چھُپانے کو۔ میرا خیال ہے کہ کالر کوٹ کو بچانے کے لئے پہننا فقط ایک بہانہ ہے بلکہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کالر انگریزی لباس اختیار کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پہلے کالر پہننا اور بند گلے کا کوٹ۔ اِس کے بعد دوسروں کے کوٹ کھُلے گلے کے دیکھ کر ایک ویسا ہی کوٹ بنوا لیا۔ اب ٹائی کی راہ نکلی۔

جب یہ سب بدل لیا تو کسی نے کہا اُن کے ساتھ پتلون زیب دیتی ہے۔ چلئے پتلون بن گئی۔ اس کے بعد ٹوپی کی کسر رہ گئی۔ سو بہت صاحب پہننے لگے ہیں۔ ارے میاں اتنے بہانے کیوں کرتے ہو۔ کہدو کہ ہم انگریز بنے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ وہ مُنہ بھی لگاتے ہیں یا نہیں۔

جدید۔ حضرت اُن کے منہ لگنے کی یہاں کسے غرض پڑی ہے۔ یہاں تو یہ اُصول ہے کہ اچھی بات ہو وہ جہاں ہو اخذ کرلو۔ ایک انگریزوں پر کیا حصر ہے۔ اس وقت مہذب دنیا کی سب قوموں کے لباس میں یہ چیز موجود ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم کسی سے پیچھے سمجھے جائیں بجنس اس لئے کہ ہمارا لباس ان کے لباس کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ کالر کے فوائد آپ سُن چکے ہیں۔ یہ ایسی چیز ہے کہ جو لوگ انگریزی لباس بھی نہیں پہنتے وہ بھی اسے اختیار کرتے جاتے ہیں۔ بمبئی کے سیٹھوں کو دیکھو کالر کے اوپر پرانی وضع کا بند گلے کا کوٹ یا چوغہ پہنتے ہیں۔ جس سے کوٹ محفوظ رہتا ہے۔ ٹائی کو اگر محض سبب زینت بھی مان لیا جائے تو بھی جائز چیز ہے۔ یہ مسئلہ درست نہیں کہ مرد زینت سے بالکل مستغنی ہے۔ مرد عورت دونوں ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے ایک دوسرے پر اچھا اثر ڈالنے کے لئے بناؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنگار کے محتاج ہیں۔ صرف کم و بیش کا فرق ہے۔ مردوں کا سادہ لباس میں شوخ ٹائی کی زینت بادلوں میں قوس قزح کا رنگ ہوتا ہے۔ آپ ناحق ان چیزوں کی مذمت کرتے ہیں۔ زمانہ انکے موافق ہے۔ آپ کیا مقابلہ کرسکیں گے۔ اپنے ہی ننھے سے صاحبزادے سے پوچھئے تو ٹائی کی فرمائش کرے گا اُس وقت محبت پدری کے تقاضے سے فرمایش پوری کرنی پڑے گی۔ اور اُس کے بعد اپنی ہی نگاہ سے بنظرِ انصاف پوچھئے گا کہ ٹائی کالر پر بندھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ ویسے بُرا کہنے کو کیا ہے۔ کالر ٹائی تو کیا آپ سارے جہان کو بُرا کہہ لیں۔ ع

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

قدیم۔ آپ کی اس تقریر سے ہمارے خیالات تو بدل سکتے نہیں۔ ہم دلیل کے قائل ہیں۔

مگر آپ جس مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ دلائل کی جگہ زبان درازی کی تعلیم ہوتی ہے +

محمد اکرام

اگر میں صحرانشین ہوتا

اگر میں صحرانشین ہوتا، تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہو جایا جاتا۔ نئی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں، اندھیری راتیں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق جیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گذر رہا ہوتا، پُر فضا گھاٹی کے پھول، اور ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رنگین اور لطیف، گانے والی بلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پُر مسرت زندگی بسر کرتا۔

مگر شہر نشین ہوں، اور کیا دیکھتا ہوں؟ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے گذر رہا ہے، ایک عالی شان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعم و گناہ کے سوا کچھ نہیں) کھڑا ہو جاتا ہے، کھڑکیوں کو کھڑا گن رہا ہے اور یوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ آگے، ایک بڑی پُر رونق دوکان کے سامنے کھڑا، حسرت سے منہ اور آنکھیں کھولے، دیکھ رہا ہے، مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کے اُس کے مُنہ میں پانی بھر بھر آتا ہے، لیکن وہ خرید نہیں سکتا۔

ایک بے والی، وارث لڑکی کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ اس کا تبسم معصوم، ایک بوسہ ناجائز پر (جس کے ساتھ اس کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پیسے دیئے جائیں گے) قربان ہو جائے گا۔

پھر ایک شرابی سامنے سے گذرتا ہے، جس کی قوت معنویہ سب محو ہو چکی ہے، جو جان جان کر زہر پی رہا ہے۔

پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہے جسے فلاکت و حاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا،

اور جسے اوروں کو عبرت دلانے، اور اُسے آیندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے زندان کو سُنے جا رہے ہیں! گویا فلاکت وحاجت زندان سے ڈرتی ہے!

ایک متعفن اور گھنی بیماری میں مبتلا فقیر کو دیکھتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ ایک فٹن، بھڑک دار فٹن میں بیٹھا ہُوا اُدھر اُدھر سے گذرتا ہے اور اس فقیر کو دیکھ کر تنفر سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔

آہ! شہر نشین ہوں، روتا ہوں اور کہتا ہوں۔

اے مایوس دلو، اے مدفون سرور مزارو! تمہارا خیال مجھے رُلاتا ہے، تمہیں سوچتا ہوں اور تم پر دل کڑھاتا ہوں۔ جیسا میرا مایوس دل ہے ایسے کتنے ہو چکے ہیں، اور کتنے اس وقت ہیں! شاید، پہلے اتنے دل خون نہ ہوتے ہوں گے، مگر اب؟ اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی، دل شکستگی نظر آتی ہے

دھڑک، دھڑک اے قلبِ یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک، ٹکڑے ٹکڑے ہو جا، جا، جا دُور ہو جا، تیرا وجود میرے لئے بارگراں ہے، تو مزار ہے +

سجاد حیدر (از بغداد)

میر انیس

مغربی نقادوں میں عموماً رسم ہے کہ کسی شخص کے کلام کا موازنہ کرنے سے پہلے اُسکی سوانحعمری پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس بالعموم شعرا کے حالات زندگی سے بالکل قطع نظر کرتے رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی

شاعر کا تذکرہ پڑھنے کے بعد اُس کی شخصیت کی نسبت سوائے نام اور ولدیت اور چند متفرق واقعات کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا اگر مختصر نویسی منظور ہو تو خالی از فایدہ بھی نہیں۔ کیونکہ دُنیا کو مشاہیر کے نام کی نسبت اُن کے کام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اسی اُصول کو مدنظر رکھ کر اس مختصر نوٹ میں ہم زیادہ تر میر انیس کے کلام سے واسطہ رکھیں گے۔

اُن کی ذات و خاندان کی بابت صرف اِس قدر کہدینا کافی ہے کہ اُن کا اسم گرامی میر ببر علی تھا۔ اور میر حسن جن کی مثنوی سحر البیان اپنی سلاست زبان کی وجہ سے آج تک مقبولِ ہر خاص و عام ہے۔ اُن کے جدِ امجد تھے۔ اس طرح پر میر انیس کو شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ اور ان کا خاندان شاید اُردو ادب کی تاریخ میں اِس حیثیت سے بالکل یکتا ہے کہ اس کے حصّے میں پانچ پشت تک شاعری کی دولت رہی ہے۔ جیسا کہ ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا۔ میر انیس کا خاندان شاہجہان آباد کی خاک پاک سے نسبت تھا۔ لیکن نامساعدتِ زمانہ نے میر حسن کو مجبور کیا کہ لکھنؤ میں بود و باش اختیار کریں۔ میر انیس کی پیدائش و پرورش اُسی مردم خیز شہر میں ہوئی۔ اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ لکھنؤ نے میر انیس کو مرثیہ گو بنا دیا۔

مرثیہ گوئی کا رواج تو ایرانیوں کی تقلید کی وجہ سے اُردو شاعری کی ابتدائی حالت ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سودا کے کلیات میں بھی چند مراثی پائے جاتے ہیں جو چنداں اعلیٰ پائے کے نہیں۔ اور اس شاعر کے کلام کا شاید سب سے کم قابلِ قدر حصّہ ہیں۔ لیکن انیس و دبیر کے زمانے تک مرثیہ گوئی شاعری کی نہایت ضعیف صنف تصوّر کی جاتی تھی۔ اور مرثیہ گو کو بالعموم دیگر شعرا طنزاً بگڑے شاعر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ انیس و دبیر کی خدا داد ذہانت نے مرثیہ گوئی کو اُس معراجِ کمال پر پہونچا دیا جس پر کہ آج ہم اُسے پاتے ہیں اور مرثیے کی زمین کو اِس قدر رفعت دی کہ ہمسرِ آسمان بنا دیا۔

ہمارا خیال ہے کہ خود مرثیہ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ کسی صاحب کمال کے ہاتھوں

میں فروغ پایا جائے۔ شاعری کے لئے اثر کا ہونا ضرور ہے اور ہماری شاعری کے جملہ اصناف میں کوئی صنف اِس قدر موثر نہیں جیسا کہ مرثیہ۔ کیونکہ اثر کے لئے صداقت لازمی ہے۔ اور مرثیہ ہی ایک ایسی شے ہے کہ جس میں شاعر جو کچھ قلم سے لکھتا ہے۔ اُسے دِل سے اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے۔ پھر ممکن نہیں کہ اثر پیدا نہ ہو۔ علاوہ بریں مرثیے کو اُردو شاعری کی دیگر شاخوں پر ایک اور بھی فوقیت حاصل ہے وہ یہ کہ اس کا مقصد نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ اس کا منشا اِن جذبات کو اُبھارنا ہے جو انسان کی ارفع یعنی رُوحانی خصلت سے تعلق رکھتے ہیں۔ برخلاف اِس کے غزل گوئی جس پر ہمارے اکثر شعرا کی توجہ مبذول رہی ہے۔ اور جس پر اوائل عمر میں خود آنیسؔ نے کافی قدرت حاصل کر لی تھی۔ بالعموم طبع انسانی کی نسبتاً ادنےٰ خواہشات و جذبات کو اُکساتی ہے۔

مندرجۂ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ انیسؔ کا پایۂ شاعری کس قدر بلند ہونا چاہیئے۔ مزید برآں ان کی زبان کی صفائی۔ خیالات کی نفاست و نزاکت اِن کو اور بھی کامیاب بناتی ہے۔ لکھنؤ کی صحبتوں نے انیسؔ کو بلاغت سکھائی۔ لیکن ناسخ کی طرح بلاغت کے ساتھ اُس فصاحت کو ہاتھ سے نہیں دیا جو دہلی کے ساتھ دُور کی نسبت ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی۔ لکھنؤ میں رہ کر عمر بھر دہلی کا روزمرہ استعمال کرتے رہے۔ اور جب کبھی کسی غیر مانوس ترکیب و محاورے کو استعمال کرتے تھے تو فوراً بلا تامل کہدیتے تھے کہ اہلِ لکھنؤ اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر احقر کے شہر اور گھرانے میں اِسی طرح بولتے ہیں[۵۱]۔ امر واقعی یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ لکھنؤ کی زبان جو تکلفات و تصنّع سے پُر ہے کبھی دہلی کی سادہ[۵۲] و شیریں زبان کے برابر موثر نہیں ہو سکتی۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو آبِ حیات مصنفہ شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد ۱۲

۵۲ شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی جیسے اہل الرائے نے باوجود دہلی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے کے اپنی شہر کی زبان کو صفائی و شیرینی کے لحاظ سے لکھنؤ کی زبان سے بہتر قرار دیا ہے ملاحظہ ہو دیباچۂ تمدنِ عرب

انیس کی شاعری میں علاوہ صداقت و اثر کے شاعری کے دیگر لوازمات تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارے کے وہ بادشاہ ہیں۔ اور کبھی تشبیہہ کے معاملے میں اپنے طبقے کے دیگر شعراء کی تقلید میں صحت مذاق کا خون نہیں کرتے۔ بلکہ غیر معمولی نازک خیالی و حسن بیان کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی خوبصورت نوجوان کے رُخ پر سبزۂ آغاز ہوتے دیکھ کر اس سے بہتر کیا تشبیہہ سُوجھ سکتی ہے کہ ع

دیکھو نئی بہار کہ سبزہ ہے پھُول پر

یا اس سے بہتر کیا مطالعۂ فطرت کا ثبوت ہو گا۔ کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتوں کی کیفیت اِن الفاظ میں بیان کی جائے۔ ع پتے برنگِ چہرۂ مدقوق زرد تھے۔ غرضیکہ اِس قسم کی نازکخیالی کی مثالیں انیس کے کلام میں سے سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں دی جا سکتی ہیں۔ نازکخیالی اُنکا خاص جوہر تھا۔ ورنہ انصاف کی بات یہ ہے کہ زور و شکوہ الفاظ میں انکے ہمعصر مرزا دبیر بازی لے گئے ہیں۔ مگر کہاں بلبل کا نغمہ اور کہاں شیر کی گرج۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں لیکن شاعری کے لئے تو کچھ اوّل الذکر ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔

انیس کی غزل گوئی کی طرف ہم پیشتر اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اِس قدر اور کہدینا کافی ہے کہ انیس کی جو غزلیات ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ لیکن ہم انیس کو بہت اعلیٰ پایۂ کا غزل گو ماننے پر تیار نہیں۔ اُسوقت لکھنؤ میں غزلگوئی کا مرض عام تھا اور ہر ایک موزوں طبیعت و رنگین مزاج نوجوان اِس میدان میں طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ مشاعروں کی قدردانی و داد اس شوق کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔ اور بڑھی ہوئی مشق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ہر ایک شاعر و متشاعر کے کلام میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ انیس کی غزلیات بھی خوبی سے خالی نہیں۔ لیکن بحیثیتِ غزلگوئی کے وہ دوسرے اساتذہ کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ غزل گوئی کی طرف توجہ کرتے تو دیگر شعراء سے اِس میدان میں بھی گوے سبقت لیجاتے۔ بدقسمتی سے اب اِس خیال کی تصدیق ہونی محال ہے۔ تاہم ہم اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہر ایک شخص ایک خاص کام کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔ انیس کا کام فطرتاً مرثیہ کو فروغ دینا تھا۔ اور اس کام کو اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔

عبدالقادر

محبّت

عروسِ شب کی زُلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
ابھی واقف نہ تھا گردش کے آئینِ مسلم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے اُبھری ہی تھی دُنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے

سُنا ہے عالمِ بالا پہ کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جسکی خاکِ پا میں بڑھکر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اِک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جسکو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھی لیکن کیمیا گر کی
وہ اِس نسخہ کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اُسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زُلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
مَلک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر اِن اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

مہوس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے گویا اس کے کارِ عالم سے

ہوئی جنبش عیاں۔ ذروں نے لُطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چمک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

پہلا سفید بال

اک گال پہ ہات دھرے بیٹھی۔ اک مہوش بارعنائی تھی آئینہ آگے رکھا تھا۔ رُخ پر حیرانی چھائی تھی۔
مہتاب سے مکھڑے پر اُسکے۔ غم کی بدلی گھر آئی تھی سہمی سُوکھی اوسان خطا مضطر ششدر گھبرائی تھی

آئینے سے چار آنکھ ہوئی۔ تو چوٹی کا یہ بھید ملا
ہے ہے! اُس مہوش کے سر میں اک پہلا بال سفید ملا

گو عمر ڈھلی تھی لیکن پھر بھی سُرخی تھی رخساروں پر چکنائی گالوں پر چھائی۔ یا روغن تھا انگاروں پر!
وہ گیسو چوٹ کیا کرتے تھے کاکل کے بیماروں پر تھے جتنے خالِ سیہ تن میں سب چشمک زن تھے تاروں پر

چہرہ اُترا تھا غیظ چڑھا تھا۔ لرزہ تن میں آیا تھا
غم چاند سے رُخ پر چھایا تھا۔ یا چاند گہن میں آیا تھا

کہتی تھی بھر کر آہ الٰہی یہ کیا ستیا ناس ہوا! جو سنبل نافہ۔ عنبر تھا۔ وہ سنبل آخر گھاس ہوا!
یہ مشک مرا کافور بنا۔ دل آج اسیرِ یاس ہوا لالے ہونگے کالے بالونکے۔ اب یہ نیا وسواس ہوا

جو زلف رسا کہلاتی تھی۔ کیا اب وہ [illegible]
کیا آج جوانی چل نکلی؟ کیا اب سے ضعیفی آئیگی؟

وہ گیسو جو ہمراہ ہوا کے۔ ناگن سے لہراتے تھے وہ بال جو پیچین میں بکھرے پر اژ ناگن کہلاتے تھے
وہ بال ہلاکے جن کے بل پیچ ہزاروں کھاتے تھے اُنکی خوبی میں بل آیا! جنپر سب بل بل جاتے تھے

اُڑ جائے انگوڑی پیری۔ مجھ کو دینے داغ کہاں آئی!
اِس میری شامِ جوانی کی کیا اتنی جلد سحر آئی!

اِس لٹ میں دُنیا لٹکتی تھی۔ اور دارا اسی کو کہتی تھی مخلوق بسی کی ماری تھی اور مارا اسی کو کہتی تھی
کل مار پھرے مارے مارے۔ خونخوار اِسی کو کہتی تھی مشکیں۔ آشفتہ۔ سرکش۔ سنبل مار اسی کو کہتی تھی

جس جوبن پہ مغرور تھی میں وہ آخر کار نہ کام آیا!
سر کا اِک بال سفید ہوا اور مرنے کا پیغام آیا!

کافر اِس حلقے میں پھنس کر زنار اسی کو کہتے تھے نافہ عنبر ظلمات۔ ختن۔ تاتار اِسی کو کہتے تھے

اچھے اچھے اِس پر مرکر۔ بیمار اِسی کو کہتے تھے　　　جادوگر۔ پُرفن۔ پیچیدہ۔ طرار اِسی کو کہتے تھے

وہ کونسا ایسا دل تھا جو اِس بحر میں غرق نہ تھا؟

اِس دام میں کتنے اُلجھے تھے اور اِسمیں سر مو فرق نہ تھا

مَیں باغ گئی تو نرگس مجھ سے دم بھر آنکھ لڑا نہ سکی　　　کوئی بلبل میری نغمہ سنجی کے مقابل آ نہ سکی

سوسن کی زبان تعریف۔ کی میری تاب ذرا بھی لا نہ سکی　　　دانتوں سے میرے پیش کبھی نسترن کسی فن جا نہ سکی

دانا بھی میرے حسن ادا کا شیدا تھا دیوانہ تھا

دو گیسو دام تھے جن میں ہر رخسار کا ہر تل دانا تھا

کیا بال کا باندھا حسن میرا اب چلنے کو تیار ہُوا!　　　کیا چوٹی کے جوبن کو میرے سر تن سے انکار ہُوا

یارب یہ کیا بدفال آیا کس دشمن کا دیدار ہُوا　　　جو میرے سر پر چڑھ کر میری خوبی کا آزار ہُوا

ہیہات۔ غضب! کیا مجھ کو کہیگا شوخ نگار نہ اب کوئی!

افسوس۔ ستم! کیا مجھ کو کریگا دل سے پیار نہ اب کوئی

کچھ سوچ کے ڈھلکو ڈھارس دیکر۔ پھر یہ سخن لب پر لائی　　　یکتا ہوں اب بھی حسن میں "میرے شانمیں کیا خفتی آئی"

ناحق ہے خیالِ خام مجھے۔ ناحق کو طبیعت گھبرائی　　　اِک بال جو پکا بھی تو کیا۔ موجود ہے اب بھی رعنائی!

خورشید کو دعوےٰ حسن کا ہو تو چرخ سے آج اُتر آئے

مہتاب کو عزّہ ہو تو میرے آگے آئے اِدھر آئے

ناگاہ ندائے غیب آئی "ہاں اَے مہوش بیزار نہ ہُوا"　　　رفتار زمانہ دیکھ کے چل اس کی شاکی زنہار نہ ہو

گلزار جہاں میں کونسا گل ہے جو مُرجھا کر خار نہ ہو　　　تو دل کو اپنے ڈھارس دے۔ بیکار الم میں خوار نہ ہو

جب زیست گھٹی۔ اور عمر بڑھی۔ تو اور بڑائی پائیگی

جو خام خرد کہلاتی تھی وہ پختہ سر کہلائیگی

جو غازہ تیری زینت تھا۔ اب دے وہ اپنی دختر کو　　　اپنے افشاں سے چن دے اپنے بہو کے چہرہ انور کو!

اولاد کو اپنی پہنا دے تو اپنے سارے زیور کو　　　اب دیکھ نہ زینت ابرو کو۔ اب دیکھ تو اپنے گھر بھر کو

بیٹی بہوؤں میں بڑائی کا یہ تجھ کو آج نوید ملا

اَے مہوش کیا غم ہے۔ سر میں گر پہلا بال سفید ملا

بیکسی

[illegible]

سوزِ بیوگی

عجب رقّت بھری اے چارہ گر! ہے داستاں میری
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر فغاں میری

پسند آئی نہ آرایش تجھے او آسماں میری
اُتاریں بدّھیاں بیدرد! توڑیں چوڑیاں میری

مبدّل غم سے شادی ہو گئی او جانِ جاں میری
کہ ٹپکی بن کے خوں آخر شرابِ ارغواں میری

فلک نے چھین لیں مجھ سے شہابی چندریاں میری
پہنتی سرخ جوڑا! ایسی قسمت تھی کہاں میری

کہاں کا شوقِ زینت! جل رہی ہیں ہڈیاں میری
گراتی مجھ پہ اب برقِ ستم ہیں بجلیاں میری

ہُوا کیا اے جوانی! وہ لڑکپن کا مرے زیور
کدھر ہے طوق منّت کا! کہاں ہیں ہنسلیاں میری

لگائی آگ آرائش کو آخر سوزِ نالہ نے
اُڑی ہونٹوں کی مسّی بن کے آہوں کا دھواں میری

بہا جاتا ہے دل آنکھوں سے خونِ آرزو ہو کر
یہ رونا ہے۔ رہیگی بیکسی یارب کہاں میری

بنایا ہے یہ کس کے سوگ نے ماتم نشیں مجھ کو
تمنّا نالہ کش میری ہے حسرت نوحہ خواں میری

وہ نقشِ نامرادی ہوں۔ سراپا درد ہوں غم ہوں
مرقّع میں جہاں کے آہ! میں تصویرِ ماتم ہوں

وہ دُکھیا ہوں۔ نہیں دردِ نہاں کا رازداں کوئی
وہ بیکس ہوں۔ نہیں سُنتا ہے میری داستاں کوئی

کرے رو رو کے کب تک شکوۂ دردِ نہاں کوئی
بہائے آہ! کب تک سیلِ اشکِ خوں چکاں کوئی

بنایا ہے سراپا داغ حسرت سوز و حرماں نے
پہنائے آہ! پھولوں کی نہ مجھ کو بدھیاں کوئی

جگر سے آہ! تھم تھم کر دھواں اُٹھتا ہے آہوں کا
جلاتا ہے کسی کو یوں بھی اے سوزِ نہاں کوئی

تقاضا لذّتِ ذوقِ خلش کا ہے شبِ غم میں
جگر میں آہ! رکھ دے چیر کر نوکِ سناں کوئی

کلیجہ تھام ہی نے کر لیا ہو اپنا جب پتھر
تو ہو پھر خاک یارب شکوۂ سنجِ آسماں کوئی

زمانہ ہو رہا ہو آہ! جب تاریک آنکھوں میں
سنوارے بام پر کیا گیسوئے عنبر فشاں کوئی

سنبھال اے ضبط! اُٹھ کر اضطرابِ دل سے ڈرتی ہوں
کہ نازک ہے زمانہ۔ ہو نہ مجھ سے بدگماں کوئی

ہوئے کیا کیا نہ آنسو خاک میں پامال گر گر کر
نہ نکلا قوم میں ان موتیوں کا قدرداں کوئی

بھلا یا چُپکے چُپکے آتشِ خاموشِ غم تو نے

بجھائی آہ! کب دل کی لگی ابرِ کرم تو نے

گھٹائیں چھا رہی ہیں آہ! دل پر یاس و حرماں کی اُمنگیں خوں رُلاتی ہیں شبابِ فتنہ ساماں کی
خلش ہے آہ! پھر نالوں میں میرے نوکِ پیکاں کی الٰہی خیر ہو دل کی۔ جگر کی۔ شہرگِ جاں کی
نہ دے بادِ صبا! تکلیف گلگشتِ گلستاں کی کہ صورت ہے ہر اک گل میں دہانِ زخمِ خنداں کی
نمونہ تصویرِ حسرت ہوں شکستِ رنگِ ارماں کی کہ مہندی ہے نہ ہاتھوں میں نہ سرخی لب پہ ہے پاں کی
گئے وہ دن۔ کہ مثلِ شوق تھے جب دوش پر گیسو درازی آہ! اب زلفوں میں ہے شبہائے ہجراں کی
یہ ہے کس کا سموم بادِ صبا! یہ کس کے پھولوں سے لپٹ کر رو رہی ہیں خون کلیاں میرے داماں کی
نہ رکھا پیرہن میں تار باقی وحشتِ دل نے الٰہی شرم تیرے ہاتھ ہے اس جسمِ عریاں کی
دواغِ عرضِ شرمِ آرزو ہے چارہ گر کس کو بگڑتا کیوں ہے منت کش نہیں ہیں تجھ سے درماں کی
پرائے جی کی وہ جانے کہ بیتا ہو پڑی بس پر کسی کو کیا خبر ہو آہ! میرے دردِ پنہاں کی

مرے دردِ نہاں کو آہ! تو بیدرد کیا جانے
گذرتی ہے جو مجھ دکھیا پہ وہ تیری بلا جانے

نشاط افروزِ شادی تو ہے منعم بزمِ عشرت میں بسر ہوتی ہے تیری شاہد و مطرب کی صحبت میں
حمائل ہاتھ تیرے گردنِ مینا میں ہیں شب کو کہ مستِ بیخودی ہے ذوقِ صہبائے مسرت میں
کسی گل پیرہن سے شب کو پہلو گرم ہے تیرا بہارِ صبحِ جنت کا ہے جلوہ شامِ خلوت میں
گذرتے ہیں ترے دن لطف سے یاروں کے جلسے میں بسر ہوتی ہیں راتیں تیری خوابِ استراحت میں
سمجھتا ہے مآلِ زندگی تو عیشِ دنیا کو کبھی ہے فکرِ ساماں میں۔ کبھی ہے حرصِ دولت میں
خبر کیا! تجھ کو او دلدادۂ ذوقِ تن آسانی کہ کٹتے ہیں کسی دکھیا کے دن کیونکر مصیبت میں
اثر ہو تجھ کو کیا بیدرد مجھ بیکس کے نالوں کا نہ دلسوزی ہے فطرت میں نہ غمخواری طبیعت میں
توقع چارۂ دردِ نہاں کی کیا کرے کوئی کہ ہمدردی نہیں جائز ہے ظالم! تیری ملت میں
کسی بیکس کا تو اے بوالہوس! ڈھانکے گا کیا پردہ کہ ہیں تیری نگاہیں رخنہ گر دامانِ عصمت میں

کہاں کی پردہ داری۔ پاسِ ناموسِ وفا کیسا
توقع قوم ہی سے اٹھ گئی۔ یا رب گلا کیسا

آزادگی

کیوں مُشتِ خاک پر کوئی دل داغدار ہو — مر کر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو
ہو کر جو ذرہ ذرہ عناصر میں جا مِلے — یکساں ہے گردِ راہ بنے یا غبار ہو
کیوں بیٹھے گرد آئینۂ دل پہ مثلِ زنگ — کیوں ذرہ ہائے خاک سے دل سنگسار ہو
آواز کی طرح جو جہاں سے نِکل گیا — پتھر کی طرح سینے پہ پھر کیوں وہ بار ہو
اللہ رے خودی کہ رہے جب تک اپنا نام — کوئی تو غمزدوں میں بھی اپنی شمار ہو

انسان کو بے ثباتی پہ بھی اپنی ناز ہے — نقشِ قدم کی طرح یہ کیوں خاکسار ہو
گھوڑے اُڑائے کیوں نہ وہ سرپٹ غرور کے — مر کر بھی جس کی روح ہوا پر سوار ہو

اِس بوالہوس کی موت کے قربان جائیے — جو پھر دوبارہ جینے کا اُمیدوار ہو
لہروں میں ڈوب مرنے کا پھر کیوں کرے وہ شوق — اِک بار غرق ہو کے جو دریا کے پار ہو
ہستی کا طوق تو ہے قیامت پسِ وفات — یارب کہیں یہ میرے گلے کا نہ ہار ہو
کملانا ہی تھا پھول کو کملا نہ عندلیب — کیوں داغِ دل سے سینہ ترا لالہ زار ہو
یکساں ہیں ہمتوں کے لئے انبساط و غم — باغِ جہاں میں آئے خزاں یا بہار ہو
دونوں کی مثل نقطۂ موہوم ہے بساط — عشرت میں خوش ہو غم میں کوئی بیقرار ہو

اے مادرِ شفیق قضا کا لگے جو تیر — مرگِ جوان کے غم سے نہ تو دل فگار ہو
اِس صیدگاہ میں وہی نکلیگا بچکے صاف — جو صید سب سے پہلے اجل کا شکار ہو
جانبر نہ ہوگا کوئی بھی تیغِ فنا سے یہاں — گو لاکھ سخت جاں ہو توانا ہزار ہو
بڑھ جائے غم کا سلسلہ کہسار کی طرح — طولانی گر یہ زندگیٔ مستعار ہو

دنیا مقام رہنے کے قابل تو ہے اگر　　بیگانہ ہو نہ اپنا عدو ہو نہ یار ہو
گل ہو نہ برگ خشک ہو بلبل ہو اور نہ زاغ　　غم کی خزاں نہ ہو نہ خوشی کی بہار ہو
جوہر نہ ہو نہ عرض نہ کل ہو نہ جزو کل　　کون و مکاں نہ ہو نہ یہ لیل و نہار ہو
حائل ہو نہ جسم کی نہ کوئی روح کی قیود　　مجبور ہو نہ کوئی نہ با اختیار ہو
آزاد بندشوں سے ہو آلائشوں سے پاک　　بندہ بھی پھر تو بندۂ پروردگار ہو
ہُو کا ہو عالم اور نہ ہو کچھ سوائے نور　　اور تیر بن کے وہ میرے سینے کے پار ہو

اے ہستی سختیاں تری کب تک سہے بشر　　میں پیٹ دوں تجھے جو میرا اختیار ہو
کیوں غم کا ڈر خوشی سے ہمایوں لگاؤ تم　　ہاں یہ بھی نذر عالم ناپایدار ہو

رکھتی ہے اپنا لطف ہر اک طرز کیفیت　　غم کا نشہ ہو یا کہ خوشی کا خمار ہو
کیا لطف دیدِ گل ہو تو ہی کہدے اے صفیر　　گلزار میں خزاں جو نہ بعد از بہار ہو
ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہیں　　کافر ہو وہ عقیدوں میں یا دیندار ہو

میخانہ ایسا چاہیئے ہم مشربو جہاں　　کوئی نہ مست ہو نہ کوئی ہوشیار ہو
پیمانۂ شکستہ کے ٹکڑے ہوں منتشر　　مے ہو نہ ساقی ہو نہ کوئی بادہ خوار ہو
پیر مغاں کے گرد ہو اک انجمن لگی　　عقل جواں بھی جان سے جس پر نثار ہو
اک سوز شعلے کی طرح ایسا بھڑک اُٹھے　　جس سے کہ دل میں آنکھ میں سر میں خمار ہو
روشن ہو نور سینے میں اک شمع کی طرح　　قربان اُس پہ دل میرا پروانہ وار ہو

ہاں کہدو صاف صاف ہمایوں جو دل میں ہے
ہونٹوں میں بڑبڑاتے یہ کیا بار بار ہو

محمد شاہدین ہمایوں

سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو!
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو!

آہ! کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو

مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا!

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

چشم نابینا سے مخفی معنئ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستئ تسلیم عشق

کیا کہوں زندوں سے میں اس شاہد مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی

اقبال

مامتا

بے خبر ہاں! تجھ کو اس بچے کی بھی ہے کچھ خبر؟
گود میں تیری ہمکتا تھا جو کل تک بار بار

گوری گوری اسکی وہ رنگت وہ مکھڑا چاند سا
اور وہ صورت اسکی جسپر رات دن تھی تو نثار

کل بلائیں لیتی تھی تو دیکھ کر انداز خواب
آج کیوں آتا نہیں سونے پہ اسکے تجھ کو پیار

اُف وہ وحشت ناک جنگل اور اندھیاری وہ رات
آہ وہ معصوم بچہ اور وہ کنج مزار

لے خبر لے دیکھ ڈر جائے نہ وہ بچہ کہیں
کیا اسے آغوش میں لینا ہے تیرا ننگ و عار

گیسوؤں میں جسکے کنگھی تو نہ کرتی تھی اگر
رات بھر رہتا تھا مثل زلف تجھ کو انتشار

مو پریشان خاک بر سر دیکھ کر اب غم نہیں
مجھ پہ اس جمعیت خاطر کا کر رمز آشکار

کیا ہوئی وہ تیری الفت کیا ہوئی وہ مامتا
کیوں نہیں اس کے لئے دل آج تیرا بیقرار

سیکڑوں صدقے اتارا کرتی تھی تو رات دن
آنکھ بھر کے دیکھنا جسکو تھا تجھ کو ناگوار

اپنے سینہ سے لگا کر تو سلاتی تھی جسے
آج وہ ہے اور اک کنج لحد تاریک و تار

آج لپٹے ہیں اُسی میں چند کیڑے قبر کے
جس گلے میں تو نے پہنائے تھے تعویذوں کے ہار

ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے اٹا سب خاک میں
ہائے وہ پیکر جو گل تاگل تھا ترے زیب کنار

جب تیری آواز سنتا تھا مچل جاتا تھا وہ
اب وہ ہے اور خامشی تو چاہے لاکھ اسکو پکار

اک اشارے سے کسی کے ہوگئی ہے آج بند
اُس کی وہ آواز جو تھی روکش صوتِ ہزار

جس کو پہنایا تھا تو نے جامۂ گلدوزِ گل
آج اُس کے تن پہ کیڑوں نے کئے نقش و نگار

زندگی میں تو ہر اک عیب و ہنر پر تھی نظر
دیکھ لے یہ حال بھی جا کر بچشم اعتبار

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

طائرِ دل

تھوڑے دن ہوئے میجر سید حسن صاحب بلگرامی سے تذکرہ شعرا ہو رہا تھا جس میں انہوں نے غالب کا ایک قطعہ سنایا۔ قطعہ کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہو مگر اسکے ساتھ ہی ان کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ اُن کے والد مرحوم سے انکو پہنچا یا اور ابتک غالب کے کسی کلام میں شایع نہیں ہوا۔ اِس کی خوبی زیادہ کر دی۔ مَیں نے اُن سے لکھ لیا اور اُن کی اجازت سے مخزن کو بھیجتا ہوں + (رشید۔ از کیمبرج)

اُٹھا ایک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا دل بیاباں سے

نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا مَیں نے کہ او نا کام! آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجکو کس ستمگر آفتِ جاں سے؟

ہنسا کچھ کھل کھلا کے پہلے پھر مجکو جو پہچانا
تو یُوں رویا کہ جوئے خون بہی پلکوں کے داماں سے

کہا مَیں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے

اُسی کے زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجکو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا!
کہ جل کر ہو گیا یُوں خاک اپنی آہ سوزاں سے

مجنوں اور مجنوں کی ساس

حضرت اکبر نے لیلےٰ کی ماں اور مجنوں کا فرضی مکالمہ ایک قطعہ میں لکھا ہے اور لطیفہ کے پیرایہ میں عاشق مزاج مسلمانوں پر چوٹ کی ہے ہمارے مکرم فرما جناب مولوی عبدالقدوس صاحب قدسی نے اس قطعہ پر کچھ اضافہ کر کے ہمیں بھیجا ہے یہ گویا حضرت اکبر کے کلام کی بیساختہ داد ہے اور ہمیں امید ہے کہ مولانا قدسی کی داد خود حضرت اکبر دینگے اس کے عنوان میں ہم نے قافیہ کی اطاعت ملحوظ رکھی ہے۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر ہمیں تو اُن کی خوشحالی سے ہے یاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلےٰ کی ماں نے کہ بیٹا تو کرے ایم اے اگر پاس
تو فوراً دوں بیاہ لیلےٰ کو تجھ سے بلا وقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچنداس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلےٰ تو استعفےٰ مرا باحسرت و یاس

قدسی

پریشاں ہو کے ماں لیلےٰ کی بولی تجھی کیا ایک ہی چھوٹو ہیں سب پیاس
نہ ہو تو صحبت مُلّا میں مدہوش کیا واعظ نے تیرا ستیاناس
ارے لڑکے تو دیوانہ ہوا ہے ذرہ تہذیب کا تجھ کو نہیں پاس
ابھی لینی ہے ال ال ڈی کی ڈگری ابھی پینا ہے انگریزی آملتاس
ابھی باقی ہے لنڈن کی سیاحت ابھی جانا ہے دان بالعین والراس

تجھے کرنا ہی ہوگا سارا دھندا ‏ لگانا ہی پڑے گا تجھ کو کمپاس
پڑھے ہے لیلےٰ تو یونیورسٹی میں ‏ رہے تو بحر و بر کا خضر و الیاس
ہمیں بھاتا نہیں داماد ایسا ‏ ہمیں آتی نہیں یہ صحبتیں راس
خدا کے واسطے آ۔ راہ پر تو ‏ سول سروس ولایت جا کے کر پاس
تو ایسا ہو تو کردوں عقد و پیوند ‏ گُہر جائے پھر مقرون الماس

بگڑ کر بلکہ تیور سے بدل کر ‏ کہا مجنوں نے اماں اہے یہ وسواس
ہو مجھ میں نیچریت واہ کیا خوب ‏ نہ ہوگا کھو نسلے میں چیل کے ماس
ہیں ڈگری یافتہ ایسے بہت سے ‏ جنہیں دیدارِ حق کی بھی نہیں آس
وہ ہنستے ہیں امورِ آخرت میں ‏ اُنہیں رہتا ہے اکثر قربِ خنّاس
اُنہیں ڈھونڈھو... میں خدارا ‏ نیو فیشن میں سونگھواُن کی بوباس
کہیں سائنس میں اُلجھے ہوئے ہیں ‏ کہیں طبعی بنی ہے اُن کا مقیاس
بچائے حق تعالیٰ اُن کے شر سے ‏ کہ ایسی فربہی ہے عین آماس
نہیں پڑتے کا میں خرخشہ میں ‏ خدارا قدرِ ایں دلدادہ بشناس
بُرا ہوں یا بھلا۔ ہوں تو مسلماں ‏ کرو اب فیل مجکو یا کرو پاس

ترانۂ محبت

ایک مختصر سی انگریزی نظم کا ترجمہ ہمارے قدیم کرم فرما مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی ایڈیٹر "اُردوئے معلےٰ" نے عنایت کیا ہے۔ عرصے کے بعد ناظرین مخزن کا اپنے ہمدم دیرینہ سے ملنا باعث مسرت ہے۔ "اُردوئے معلےٰ" کے جاری ہونے سے پہلے آپ اکثر مضامینِ نظم و نثر سے ہمیں ممنون فرماتے تھے۔ پھر اپنے کام کی کثرت سے مجبور ہوگئے اور مخزن کے لیے کچھ نہ لکھ سکے۔ لیکن اب اُنہوں نے پھر وقتاً فوقتاً اپنا کلام

بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے:۔

وادیِ کوہ میں وہ برف پہ چمکا جس دم　　　ماہِ روشن کو نکلتے ہوئے دیکھا میں نے
اور کس قصد سے اُس وقت اُٹھاتے تھے قدم　　　اپنے آہو سے بھی یہ راز چھپایا میں نے

آگیا پاس مرے دوڑ کے کیونکر آخر　　　ہو گیا قصد مرا کیسے ہرن پر روشن
میری وارفتگیِ شوق سے واقف تھا اگر　　　آگیا کوچۂ جاناں میں جبھی تو یہ ہرن

مہرِ تابندہ سے جب گرم زمین ہوتی ہے　　　بے دلی جوشِ مسرت سے بدل جاتی ہے
یاد تکلیفِ جفا کاریِ سرما دل سے　　　آمدِ موسمِ گرما سے نکل جاتی ہے

مہرِ اُلفت سے تری جب سے ہُوا دل روشن　　　نہ رہا نام و نشان رنج و الم کا باقی
مہر سے بڑھ کے ہے خورشیدِ محبت کا چلن　　　اب نکل کر سوئے مغرب یہ نہ جائے گا کبھی

حسرت موہانی

اندھی پھول والی کا گیت

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول　　　تو خریدار و یہ اندھی بیچنے والی کے پھول
تم ہو جس دُنیا کے ساکن نور کی دُنیا ہے وہ　　　عالمِ ظلمات۔ مجھ مجبور کی دُنیا ہے وہ
ہو مُبارک تم کو دُنیا کے نظارے دیکھنا　　　دن کو نورِ مہر شب کو چاند تارے دیکھنا
میں جہاں ہوں ہے اندھیرا گھُپ جہاں چھایا ہُوا　　　ہے تصور اِس سیہ خانہ میں گھبرایا ہُوا
تم کو قدرت نے عطا کی قوتِ نظارگی　　　اور میں محروم قدرت بندگی بیچارگی
نظمِ دُنیا کا ہے جامِ جم تمہارے واسطے　　　تم ہو عالم کے لئے عالم تمہارے واسطے
فلسفہ قدرت کا اِن پھُولوں میں دکھلاتی ہوں میں　　　اِن میں جو جو خوبیاں ہیں تم کو سمجھاتی ہوں میں
طفلِ غنچہ بڑھکے یہ آزاد گل بنتے ہوئے　　　آ گئے ہیں اپنی ماں کی گود سے چھوٹے ہوئے
وہم ہے نقش و نگارِ گل غلط ہے یہ گمان　　　عارضِ گل پر ہیں پیاری ماں کے بوسوں کے نشان
باعثِ عبرت ہے ان کا عالم افسردگی　　　مادرِ گیتی سے چھُٹ کر پائی ہے پژمردگی

نازپرورد چمن ہیں یہ جوانانِ چمن — حُسن کی دُنیا کے ساکن ہیں یہ یارانِ چمن
کل کے دن تک تھے یہی سب طرۂ دستار باغ — اِن کی رونق دیکھتی تھی نرگسِ بیمار باغ
دستِ گلچیں سے حفاظت دل میں تھے ٹھانے ہوئے — خارِ گلشن ہر طرف تھے برچھیاں تانے ہوئے
جب ہوئے پورے جواں تو ہوگئے عاشق مزاج — اب تو اِن کو صاحباں حسن کی ہے احتیاج
آرزو یہ ہے کسی کی طرۂ دستار ہوں — خواہشیں یہ ہیں حسینوں کے گلے کا ہار ہوں
باوفا خود ہیں اور ہر حالت میں یہ دلسوز ہیں — اور حسینوں کو اتالیقِ وفا آموز ہیں
ہمدمِ راحت بھی ہیں اور غمگسارِ غم بھی ہیں — رونقِ شادی۔ شریکِ محفلِ ماتم بھی ہیں
صرفِ بزمِ عیشِ معشوقِ ستم ایجاد بھی — اور کبھی زیبِ مزارِ عاشقِ ناشاد بھی
لو خریدارو چلو یہ بے رخی اچھی نہیں — رات بھر کی ہے یہ رونق صبح کو کچھ بھی نہیں
خندہ زن ہیں ایک شب کی زندگانی کیلئے — اپنے گھر لیجاؤ اِن کو میہمانی کے لئے

سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی

عبدالقادر کے نام

اِس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے مجھے اِس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے اور ایسے بلند ارادوں میں مجھے شریک کیا گیا ہے۔ سوائے اِس کے کہ دل اپنے دلنواز کی محبت کا شکریہ ادا کرے اور میں یہ دُعا مانگوں کہ خدا حضرت اقبال کے ارادوں میں برکت دے۔ اور اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت مُلک کی لکھی ہے تو مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ کوئی جواب اِس خط کا مجھ سے بن پڑتا نہیں۔ خصوصاً جب جناب اقبال کے اشعارِ آبدار کے مقابل اپنی نثر کی خشکی اور بے مایگی پر نظر کرتا ہوں ٭

(عبدالقادر)

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اِسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کردیں

پھونک ڈالا تھا کبھی دفتر باطل جس نے حدتِ دم سے اسی شعلے کو پیدا کردیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق سنگ امروز کو آئینۂ فردا کردیں
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر اُن کو تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کردیں
تنِ آتش زدۂ شوق کو مانندِ سرشک قطع منزل کے لئے آبلۂ پا کردیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر قطرۂ شبنم بے مایۂ کو دریا کردیں
رخت جاں بتکدۂ چین سے اُٹھالیں اپنا سب کو محوِ رُخِ سعدائے وسلیمیٰ کردیں
درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں جنس کمیاب ہے۔ آ نرخ کو بالا کردیں
دیکھ! یثرب میں ہُوا ناقۂ لیلیٰ بے کار قیس کو آرزوے نو سے شناسا کردیں
زاہدِ شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال خشک ہے۔ اس کو غریقِ نمِ صہبا کردیں
بادۂ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کردیں
سنگ رس شاخِ چمن ہم نے نشیمن کیلئے اپنے بے دردوں کو آمادۂ ایذا کردیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کردیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

ہر چہ در دل گذرد وقفِ زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

محمد اقبال

بیرسٹر ایٹ لا - لاہور

ہلالِ عید

دیکھو! دیکھو! وہ میں نے دیکھ لیا قُلۂ کوہ سے ذرا اونچا!
چھُپ گیا چھپ گیا کہیں دیکھو! پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو!
وہ جو ہے سامنے شجر دیکھو! اِس سے اوپر اُٹھا نظر دیکھو!

اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا
مژدہ اے دوستو! نظر آیا

مرحبا اے ہلالِ شامِ سعید　　لیکے آیا ہے تو بشارتِ عید
مخبرِ صبحِ عیش و عشرتِ عید!　　تجھ سے وابستہ ہے سعادتِ عید
مژدہ عید، ایک شب پہلے　　لائے گا، جانتے تھے سب پہلے
پر یہ تھی انتظار کی صورت　　کہ نہ دیکھی قرار کی صورت!
تھا تری جستجو میں پیکِ نظر　　دشتِ چرخِ بریں میں محوِ سفر
کہ یکایک کرم کیا تُو نے　　اپنا چہرہ دکھا دیا تُو نے!
تُو کفیلِ نشاطِ عالم ہے　　باعثِ انبساطِ عالم ہے
تو عجب شئے ہے میکشوں کیلئے　　کشتیِ مے ہے میکشوں کیلئے

دُور سے یہ ترا اشارہ ہے
اوج پر عیش کا ستارہ ہے

واہ اے شاہدِ کمان ابرو!　　کس ادا سے تنا ہوا ہے تو
خود نمائی بھی ہے، ادا بھی ہے!　　اس پہ پھر کاہشِ حیا بھی ہے!
یہ ترا بانکپن، یہ رعنائی　　بزمِ بالا میں خلوت آرائی
ہے سزاوار تجھ کو ناز و غرور　　کھینچ بے شک تو اپنے آپ کو دُور
سارا عالم ہے تیرا شیدائی　　سب کو دیکھا ترا تماشائی
تھی زمانے کو جستجو تیری　　محفلوں میں تھی گفتگو تیری

چشمِ بد دور کیا نزاکت ہے
تجھ پہ بارِ نظر بھی آفت ہے

یوں عیاں ہے شفق کے دامن میں　　جیسے مہرو ہو کوئی گلشن میں
یا کوئی جیسے خنجرِ نازک　　زینتِ دستِ دلبرِ نازک
خونِ عاشق سے سرخرو ہو کر　　ناز کرتا ہو اپنی برش پر!
یا کوئی جیسے نقرئی کشتی　　قلزمِ سرخ پر ہو تیر رہی
اک جہاں اُن کا ہو تماشائی　　کرتی جائے وہ بحر پیمائی

رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو　　تکتے رہ جائیں لوگ سب اُس کو

اے لو پیچ پچ وہ صورتِ زورق
ہو گیا گم میانِ شام و شفق

تربتِ جاناں

ہوائیں ہو گئیں خاموش۔ وقتِ شام آپہنچا　　اندھیرا چھا گیا ہر سمت عالم ہے خموشی کا
نہیں پائے صبا تک کی ذرا آہٹ گلستاں میں　　اِسی عالم میں آنکلا ہوں میں شہرِ خموشاں میں
دلِ مہجور میں اک لالہ زارِ داغ لایا ہوں　　میں اپنے گل کی تربت پر چڑھانے پھول آیا ہوں

اب آرامیدہ ہے اس تنگ کاشانے میں وہ مٹی　　شعاعِ زندگی کل جس کے ذرّوں سے چمکتی تھی
غضب ہے ایسے حُسن و ناز کا صیدِ قضا ہونا!　　بایں اوصافِ محبوبی یہ تیغِ فنا ہونا!

قضا! اُس گلبدن پر رحم کھا کر کاش ٹل جاتی!　　خدا کے حکم سے تحریر قسمت کی بدل جاتی!
تو گورستان میں یوں دُکھڑے نہ روتا میں حزیں ہو کر　　نہ کہتا مرثیہ یوں آج میں اندوہگیں ہو کر

مگر رونے سے کیا حاصل؟ وہ رُوحِ نورتو یاں سے　　گئی اُڑ کر کہیں اونچی مہ و مہرِ درخشاں سے
ملائک لے گئے با چشمِ گریاں اُس کو جنت میں　　جہاں نیکوں کی روحیں تا ابد رہتی ہیں راحت میں

یہ جرأت کس طرح سے ہو سکے انسانِ فانی کو　　کہ دے الزام خالق کے نظامِ جاودانی کو
سرِ تسلیم رکھوں گا سدا خاکِ اطاعت پر　　سدا راضی رہوں گا اپنے مالک کی مشیت پر

مگر دل کو برابر دُھن ہے اُس گل کے محاسن کی　　رہیگی یاد اُسکے حُسنِ ظاہر حُسنِ باطن کی
اُسی کی یاد میں اشکِ محبت میں بہاتا ہوں　　تصوّر کو اُسی کے تختِ دل پر میں بٹھاتا ہوں

(نیرنگ)

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو — مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو

متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو — ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو

زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو — مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل — عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

خط منظوم

شمس العلما مولانا شبلی اپنے ایک غیر زبان دان دوست کے خط کی داد جس کی اردو صحیح اور با محاورہ تھی ذیل نظم میں دیتے ہیں:-

دی یکے گفت کہ در ریختہ، انشائے سخن — شیوۂ ہست کہ مخصوص زباندان باشد

گفتم البتہ چنین است کہ گفتی، اما — نیست کارے کہ بروں از حدِ امکاں باشد

مردِ دانا بتواند کہ بہ تحصیل و بہ سعی — با عرب حرف زند گرچہ ز ایراں باشد

ما دریں حرف، کہ پیکے برسانید بہ من — نامۂ را کہ گراں مایہ تر از جاں باشد

نامہ وا کردم و با نازش بسپردم کہ ببیں — ایں چنیں حرفِ دل آویز نہ آساں باشد

نامہ راخواند و بفرمود کہ شک نیست دریں | کایں چنیں حرف زدن کارِ زباندان باشد
کہ بود؟ صاحبِ ایں نامہ و اصلش ز کجاست؟ | اعتبارِ گہر۔ از فرخیٔ کاں، باشد
گفتمش ریختۂ خامہ ... ہست ایں | کز دکن ہست و مرا ہمچو عزیزاں باشد
یارب آں دست و قلم در کنفِ حفظ تو باد | تا جہاں باشد و تا گنبدِ گرداں باشد

شبلی

برق کلیسا

خان بہادر سید اکبر حسین کا کلام یوں تو ہمیشہ دل میں چٹکیاں لینے والا ہوتا ہے مگر یہ نظم "برق کلیسا" غضب کی چیز نکلی ہے اس میں نہ صرف حسن و عشق کی تصویر کھینچی گئی ہے بلکہ شرق و غرب کی تہذیب کی بڑائی بڑی خوبی سے دکھائی گئی ہے "برق کلیسا" یہاں ایک غریب مسلمان کے خرمن ایمان پر گرتی اور اسے جلا دیتی ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس جنگ و جدل میں ہمیشہ ایک ہی طرف رہیگی۔ خود جناب اکبر فرما چکے ہیں۔ ؏ اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے:۔

رات اِس مِس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار | ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار
زُلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید | قدرِ عنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں | گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سُننے کو شعلہ لپکے | دلکش آواز کہ سُنکر جسے بلبل چہکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں | سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جُھک جائیں
آتشِ حُسن سے تقویٰ کو جلانے والی | بجلیاں لُطف تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حُسنِ بیان۔ شوخیٔ تقریر میں غرق | ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
پس گیا۔ لوٹ گیا۔ دل میں سکت بھی نہ رہی | سر جو تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی
ضبط کے عزم کا اُس وقت اثر کچھ نہ ہُوا | یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہُوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایمان ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میدان میں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ابھی ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

دشمن صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دل زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح

شجر طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہے براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

اب نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہر تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایمان کا تیرے آئینۂ رو پہ نثار

اُٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیر مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو ایجان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم
تو نکالو دل نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

خاں بہادر سید اکبر حسین

دو ستارے

آئے جو قِران میں دو ستارے — کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب — انجامِ خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنّا — پیغامِ فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدر — ہر ایک کی ہے مقرر
ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئینِ جہاں کا ہے جدائی

(اقبال)

حیاتِ انسانی

انسانِ بے بنیان کی ہے زندگی اِک آن کی — آئی قضا انسان کی۔ تو الوداع ہے جان کی
یہ برق ہے یا ہے شرر۔ یا سایۂ دیوار و در — شبنم ہے ہمشکلِ گہر یا غنچۂ گلزار تر
شکلِ نمودِ شام ہے۔ یا صبح کا ہنگام ہے — اِک شعبدے کا دام ہے۔ جو زندگانی نام ہے
بجلی چمک کے رہ گئی۔ اُڑ کر شرر غائب ہوا — سایہ ہٹا شبنم اُڑی۔ غنچہ کھلا مُرجھا گیا
شب نے مٹایا شام کو۔ دن نے سحر کی جان لی — ناگاہ ٹوٹا شعبدہ۔ موت آ گئی انسان کی
ہستی ندی کی دھار ہے۔ جو مائلِ رفتار ہے — ہے یہ زمانہ عیش کا جو دو گھڑی کا یار ہے
یا ہے چھلاوہ حسن کا۔ یا عشوۂ عیار ہے — یہ انتقالِ انسان کا۔ رنگِ رخِ دلدار ہے
یا ہے ہلالِ آسماں۔ یا طوطیِ شکر فشاں — یا جلوۂ خوابِ گراں یا ہے شفق۔ یا کہکشاں
دھار آئی اور جاتی رہی۔ گذرا زمانہ عیش کا — عشوہ۔ چھلاوہ مٹ گیا۔ رنگِ رخِ دلبر اُڑا

ڈوبا ہلال آسماں پھُولی شفق پھر بھی کہاں — شب کا ہُوا لشکر عیاں تو کہکشاں ہے بے نشاں
آنکھیں کھلیں جاگا بشر پھر خواب کا نقشہ کدھر — پنجر اکھلا۔ طوطی اُڑا۔ انسان فانی چل بسا!
(سائی من وِ اسٹیل) ———— (طالب بنارسی از بمبئی)

زمزمۂ نشاط

زندگی مزے کی ہے۔ لطفِ جاں اُٹھائے جا — لطفِ جاں اُٹھائے جا۔ یہ مزے اُڑائے جا
حملہ ہائے فکر و غم۔ ہیں اگرچہ دمبدم — وار سب بچائے جا۔ فکر و غم ٹلائے جا
ظلم دشمناں سہی۔ جورِ دوستاں سہی — رشک رازداں سہی۔ بھُول جا بھُلائے جا
داغ رفتگاں سہی۔ سوزشِ نہاں سہی — داغ یہ چھپائے جا۔ آگ یہ بجھائے جا
ماجرائے حُسن و عشق۔ خارِ دل اگر بنے — دل سے تو نکال پھینک۔ یہ خلش مٹائے جا
زندگی کہیں جسے۔ وہ تو سیلِ آب ہے — بہہ چل اور بہائے جا۔ یہ چل اور بہائے جا
شب زیادہ شمع کم۔ ہے اگر تو کیا ہے غم — جب تلک کہ جل سکے۔ یہ بھڑک جلائے جا
مغتنم ہے ساقیا۔ فرصتِ انبساط کی — پی بھی اور پلائے جا۔ پی بھی اور پلائے جا
ماسلف پہ خاک ڈال۔ کل پہ چھوڑ کل کا حال — جام و شیشہ اب سنبھال۔ دورِ مے چلائے جا
جو ہُوا وہ ہو چکا۔ عاقبت کی فکر کیا — آج ہے بڑا مزا۔ یہ مزا اُڑائے جا
میری جان عندلیب۔ بامِ شاخسار سے — تہنیتِ نو بہار سے۔ فرطِ انبساط سے
مستیٔ نشاط سے۔ خوب چہچہائے جا
خوب چہچہائے جا۔ فصلِ گُل منائے جا
فصلِ گُل منائے جا۔ راگنی سُنائے جا
راگنی سُنائے جا۔ یہ دل مرا لبھائے جا
محوِ نغمۂ طرب۔ تو مجھے بنائے جا
تیری زندگی ہے راگ۔ میری زندگی ہے رنگ — راگ رنگ مِل گئے۔ مَیں سُنوں تو گائے جا

گل لئے جا بجائے جا۔ تو سب چہچہائے جا
مست نغمۂ نشاط۔ تو مجھے بنائے جا

اے خیال ابتدا۔ اے خیال انتہا
اے خیال احتیاط۔ اے خیال احتیاج
اے خیال معصیت۔ اے خیال معدلت
اے ہوائے آرزو۔ اے امید بیم و تو

دو گھڑی تو چین لے۔ اتنا مت ستائے جا
اتنا مت ستائے جا۔ ہوش مت اڑائے جا

گل پھول کھلائے جا۔ سبزہ لہلہائے جا
ہائے وہ تو اڑ گئی۔ لو یہ کیا سنا گئی
بے طلب تو ہاتھ آئے۔ اور طلب سے بھاگ جائے
خدمت خدا و خلق۔ ہے نشاط زندگی

میری پیاری عندلیب۔ تو بھی چہچہائے جا
جستجوئے عیش میں۔ عمر مت گنوائے جا
اشتیاق انبساط۔ دل سے تو بھلائے جا
اس میں اپنا جان و مال۔ شوق سے لگائے جا

اعجاز حسین بی۔ اے

نظم قومی

مقام عبرت ہے دور گردوں۔ ذرا بصیرت کی آنکھ وا کر
فلک کے پردوں میں راز کیا ہے کبھی تو یہ آگہی سنا کر

ہے کیسا یہ انقلاب جاری۔ زماں میں جاری مکاں میں ساری
نہ اس سے خاکی بچا نہ ناری۔ فلک تک پہنچا زمیں پہ چھا کر

کہیں بلندی کہیں ہے پستی۔ یہی ہے رمز مصاف ہستی
اسے ابھارا اسے دبا کر۔ اسے جگایا اسے سلا کر

جبل ہیں دریا میں گلستاں میں تلخ میں ماہی ہیں انس و جان میں
سدا قوی ناتواں میں۔ رہا تنازعہ جہاں میں آ کر

ہے مصر کا گاہے دور دوراں۔ ہے گاہ یونان کا فر و شاں
کبھی ہے ایراں کبھی ہے توراں۔ گئے یہ سب تو بنے بنا کر

کل ایشیا کی تھی کامرانی۔ ہے آج یورپ کی لن ترانی
غرض یوں ہی دور آسمانی بگاڑتا ہے بنا بنا کر

خدا کی ذات ہی سدا لا یغیر اللہ ما بقوم
مگر بدلتی رہی ہیں قومیں۔ عمل کی بنیاد اپنی پا کر

یہ بحرِ مواج کے تھپیڑے۔ ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے ہیں پہنچے ساحل پہ اہلِ ہمت۔ طلب کے چپو چلا چلا کر

کئے جوانوں نے دشت رنگیں۔ لئے دلیروں نے حصارِ سنگیں لہو کے دریا بہا بہا کر۔ سروں کی بھینٹیں چڑھا چڑھا کر

جو قوم سے لو لگا رہے ہیں۔ وہ نقدِ جاں تک لٹا رہے ہیں جو کالجِ ملت بنا رہے ہیں۔ بنائیں اپنے گھروں کی ڈھا کر

ہیں جنکے سینوں میں دل پھڑکتے۔ وہ مشکلوں سے نہیں جھجکتے ہیں مثلِ پروانہ سر ٹپکتے۔ وہ عشق میں بال و پر جلا کر

ہیں راہرو گرتے پڑتے جاتے۔ وہ ترقی میں بڑھتے جاتے ہیں بامِ دولت پہ چڑھتے جاتے۔ کمندِ ہمت لگا لگا کر

الٰہی خیر اپنے قافلے کی۔ نہیں جسے فکر مرحلے کی یہ مست خواب اب بھی سو رہے ہیں۔ تھکے سب انکو جگا جگا کر

کچھ ایسی قسمت ہے انکی پھوٹی۔ کہ اوجِ عزت کی آس ٹوٹی ابھی تو شاخِ مراد سے یہ۔ گرے ہیں جھولے جھلا جھلا کر

یہ دولت و ملک و کامرانی۔ تو سب بہا ہیں نقش آنی جانی مگر یہ سیلاب کی روانی۔ تو لیگئی دین و دل بہا کر

دلوں میں اپنی نہاں ہیں کینے۔ بھرے ہیں بغض و حسد سے سینے یہ بہگئے قوم کے دفینے۔ وہ گنجِ الفت لٹا لٹا کر

ہے رہنماؤں کا زور ہر سو۔ ہے پیشواؤں کا شور ہر سو بنائے کیا کیا طلسمِ کثرت۔ وہ رنگِ وحدت مٹا مٹا کر

رہو گے اس دار و گیرِ دوراں میں۔ ہمہ تو مستِ خواب کب تک

بہے گی امواج جہانستاں میں۔ یہ آن بان اے حباب کب تک

خدا کی رحمت ہو اہلِ دل پر۔ جو قوم کا غم ہیں کھانیوالے مجالس اسکی سجانیوالے۔ سفر کی زحمت اٹھانیوالے

ہیں صدرِ بزم اپنے فخرِ ملت۔ وہ ملتوں کے ملانیوالے چہار یار اور پنج تن کی۔ کدورتوں کو مٹانیوالے

سدا رہا انکا فیض جاری۔ ہے شاکرِ لطف قوم ساری الٰہی انکو بنائے رکھیو۔ ہیں اپنی بگڑی بنانیوالے

وہ افضل الفاضلین ہی ہیں۔ وہ اکمل الکاملین ہی ہیں کلامِ حق کی دکھا کے مشعل۔ دلوں کی ظلمت گنوانیوالے

ادیبِ قومی خطیبِ قومی۔ [illegible] زبانِ معجز بیان کا اپنی۔ جہاں میں سکہ جمانیوالے

وہ میر اخوند زادہ المعالی۔ لسانِ اسلام [illegible] بتوں کی الفت چھڑانیوالے۔ وہ قوم سے لو لگانیوالے

رہے سلامت یہ ظلِ عالی۔ الٰہی پیرانِ [illegible] دل کا وگرنہ عالم میں پھر نہ دیکھینگے صورتیں یہ [illegible]

ہے سخت قحط الرجال ہم میں۔ ہے باکمالوں کا کال ہم میں نہ اہلِ جاہ و جلال ہم میں۔ نہ مال و دولت خزانیوالے

ہیں موجِ دریا پہ گر خطر ہیں۔ یہی تو اب ناؤ کے کھِوَیّا یہ کوٹ پتلون ٹائی والے۔ یہ آئینے والے شانیوالے

سنیں یہ فریادِ انجمن کی۔ سب اہلِ پنجاب گوشِ دل سے وہ اپنی قسمت کے فیصلے کا۔ ہیں آج محضر لکھانیوالے

جو بھیک پر ہو مدارِ ہستی۔ تو کچھ نہیں اعتبارِ ہستی ہم آج کالج کی زندگی کا۔ ہیں تم سے بیمہ کرانیوالے

مکاں کی ابتداء غ بیل ڈالو دیئے میں جلد اس کے تیل ڈالو
وگرنہ اسکا چراغِ ہستی۔ ہیں کوئی دن میں بجھانیوالے

نئی بنائیں بنانی ہونگی۔ چھتیں بھی گھر کی اٹھانی ہونگی
کہ حکمِ حاکم سے فیلبانوں کو۔ ہم ہیں جہاں بنانیوالے

غضب ہے اک درسگاہِ قومی کے ہیں بنانے سے آج قاصر
تھے جنکے اسلاف روضۃ التاج و بیت حمرا بنانیوالے

یہ سچ کہا ہے کسی نے۔ بہتر ہے موت بے صرفہ زندگی سے
ہم اپنی ذلت سے نامِ اسلام۔ پر ہیں دھبہ لگانیوالے

عزیزو اس میں جٹ رہ جانا۔ کچھ اپنی غیرت کی یادگاریں
کہ نقشِ پا پر تمہارے لاکھوں۔ ہیں قافلے پیچھے آنیوالے

نہیں جہاں میں کوئی ٹھکانا۔ جز آستانِ شہِ دوعالم
کہ جس کے دربار میں ملائک ہیں عجز سے سر جھکانیوالے

وہ جلوۂ ذاتِ ذوالجلالی۔ وہ مظہرِ شانِ ذوالجمال
کہ جسکے در پر سدا سوالی۔ مرادیں دل کی ہیں پانیوالے

وہ اہلِ زور اور اہلِ فن کے طلسمِ حیرت مٹانیوالے
وہ چشمِ اہلِ جہاں کو نورِ خدا کا منظر دکھانیوالے

وہ ہفت کشور میں عدل و انصاف کی منادی کرانیوالے
وہ چار دانگِ جہاں میں وحدت کی پنج نوبت بجانیوالے

وہ خاکِ یثرب کو سرمۂ چشمِ اہلِ ایمان بنانیوالے
عرب کی بے آب ریگِ صحرا پہ سیلِ رحمت بہانیوالے

ہمارے مولا ہمارے والی! ہیں آستاں پر ترے سوالی
یہ نونہالانِ باغِ قومی کو گودیوں میں کھلانیوالے

سلام و صلوٰۃ تم پہ لاکھوں۔ شفیعِ روزِ جزا ہمارے
نہیں ہے بیڑے کو خوفِ طوفاں۔ جو آپ ہیں ناخدا ہمارے

پیامِ عشق

سن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہو جا

دیارِ خاموشِ دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو
کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورتِ حرفِ راز ہو جا

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

گئے وہ ایّام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانند شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدائے ملت ہو یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

(اقبال)

پدمنی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم — اور پروانوں کو دی سوزِ وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم — آئی حصے میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم
نرم و نازک تجھے اعضا دیئے جلنے کے لئے
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کے لئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا — خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر قالبِ نور میں پتلا تیرا — یدِ قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوزِ غمِ شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو — تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونقِ خلوتِ شاہانہ بنایا تجھ کو — نازشِ ہمتِ مردانہ بنایا تجھ کو
ناز آیا ترے حصے میں - ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی محبت بھی - وفا بھی آئی

آئی دنیا میں جو تو حسن میں یکتا بن کر　　چمنِ دہر میں پھولی گُلِ رعنا بن کر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا تو تارا بنکر　　دلِ شوہر میں رہی خالِ سویدا بن کر

حسنِ خدمت سے شگفتہ دلِ شوہر رکھا
کہ قدم جادۂ طاعت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مروت بھی تھی غمخواری بھی　　تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوۂ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی　　درد آیا ترے حصے میں تو خودداری بھی

آگ پر بھی نہ تجھے آہ! مچلتے دیکھا
تپشِ حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی اور آئینہ سیما تصویر　　حسنِ سیرت سے تھی تیری متجلا تصویر
لاکھوں تصویروں سے تھی ایک تری زیبا تصویر　　تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر

نور ہی نور ترے جلوۂ مستور میں تھا
انجمِ ناز کا جھرمٹ رخِ پُرنور میں تھا

لب میں اعجاز حیا چشمِ فسوں ساز میں تھی　　کہ قیامت کی ادا تیرے انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تری دیدۂ غماز میں تھی　　برقِ بیتاب تری جلوہ گہِ ناز میں تھی

یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں
شعلۂ نارِ عقوبت کی تڑپ تھی جس میں

یہ وہ بجلی تھی جو تیغِ شرر افشاں ہوکر　　کوند اُٹھی قلعۂ چتوڑ میں جولاں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی جو سوزِ غمِ حرماں ہوکر　　خاک سے لوٹ گئی تیری پشیماں ہوکر

یہ وہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا
رفتہ رفتہ تپشِ سوزِ جگر نے پھونکا

آہ! اے شوخی و انداز و ادا کی دیوی　　آہ! اے ہند کے ناموسِ وفا کی دیوی
آہ! اے پرتوِ انوارِ صفا کی دیوی　　اور زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی

تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ اب تک

تیری عفت کا زباں پر ہے افسانہ ابتک

آفریں ہے تری جاں بازی و ہمت کیلئے
آفریں ہے تری عفت۔ تری عصمت کے لئے

کیا مٹائیگا زمانہ تری شہرت کے لئے
کرچلی آتی ہے اک خلق زیارت کے لئے

نقش ابتک تیری عظمت کا ہے بیٹھا دل میں
تو وہ دیوی ہے ترا لگتا ہے میلا دل میں

منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی

ماتمِ آرزو

اے دلِ مُردہ! کہاں اب روزگارِ آرزو
ناامیدی کرچکی کب کا فشارِ آرزو

ہائے! وہ دل جسمیں اُمیدوں کی تھی بزمِ نشاط
اُس میں ہے اک آہ! چھوٹا سا مزارِ آرزو

مٹ نہ جانا۔ تجھکو میری ناامیدی کی قسم!
اے جگر کے داغ! ہے تو یادگارِ آرزو

چارہ گر! دستِ تسلّی میرے سینے پہ نہ رکھ
آہ! اس منقل میں پنہاں ہیں شرارِ آرزو

اب کہاں بزمِ تمنا۔ اے دلِ خمیازہ کش!
مَیں ہوں۔ تُو ہے۔ اور تکلیفِ خمارِ آرزو

ناتواں ہے۔ یہ نہ جائے ہوکے خونابِ جگر
لے نہ چُٹکی دل میں دردِ انتظارِ آرزو

کب سے تیرے منتظر داغِ جگر کے پھول ہیں
تو کہاں ہے؟ آہ! اے طاقِ مزارِ آرزو

حسرتِ مُردہ کے غم میں ہائے میرے غمگسار!
مر مٹا کیا تو بھی شوقِ بیقرارِ آرزو

خارزارِ یاس و حرماں آہ! اب پہلو میں ہے
دل کہ تھا اک باغِ نیرنگِ بہارِ آرزو

ہائے! وہ راتیں مرادوں کی۔ اُمنگوں کے وہ دن
ہائے! وہ تسکین فزا لیل و نہارِ آرزو

ہلکا ہلکا ہائے! وہ جامِ تمنا کا سُرور
ہائے! وہ ذوقِ شرابِ خوشگوارِ آرزو

چارہ گر! سینے پہ رکھ کر دیکھتا ہے ہاتھ کیا
دل تڑپتا ہے پڑا۔ زیرِ مزارِ آرزو

بیکسی! بزمِ نشاطِ دل میں کیا رکھا ہے اب
جمع ہے کچھ گرد حسرت کچھ غبارِ آرزو

میرے پہلو میں تڑپتا ہے جگر بھی دل کے ساتھ
آہ! یہ بھی ہے شہیدِ انتظارِ آرزو

آج وہ بھی مٹ گیا۔ لو ہو گیا قصّہ تمام
داغِ حسرت دل میں تھا اک یادگارِ آرزو

کیا خبر تھی ایک دن مجھ سے جدا ہو جائے گا
تیرا آغوشِ تمنّا اے کنارِ آرزو

دل کی کشتی تیری موجوں میں بہی جاتی ہے ہائے!
آہ! اے سیلِ گریۂ بے اختیارِ آرزو

چل دیا پامال کر کے آہ! دل کو تو کہاں
اے سمندِ ہستیٔ ناپائدارِ آرزو

آ رہی ہے بیکسی کی آہ! پتلے سے صدا
راکھ میں میری ہیں اب بھی کچھ شرارِ آرزو

تنِ جگر سے پاک ہے کب تک کریگا تو رفو
اے رفوگر! دامنِ صبر و قرارِ آرزو

ہے دلِ مُردہ کی تربت بھی وہیں اے بیکسی!
جس جگہ ہے میرے پہلو میں مزارِ آرزو

ایسا ٹوٹا آہ یہ کانٹا کہ اے دستِ جنوں
مرتے مرتے بھی نہ نکلا دل سے خارِ آرزو

اے رفیقِ صحبتِ دیرینۂ بزمِ نشاط
دل میں آ جا! اے خیالِ غمگسارِ آرزو

تجھ کو بھی رونا پڑے گا ایک دن اے بیکسی
تو رہی یونہیں جو چندے سوگوارِ آرزو

شوق جہاں آبادی

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سُرخ سے رنگین ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا!

کھڑے ہیں دُور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل!

نظارہ موج کو پھر وجہ اضطراب ہے کیا؟
یہ کہنہ مشق نو آموزِ پیچ و تاب ہے کیا؟

مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

نمازِ شام کی خاطر یہ اہلِ دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان بانکل ہیں کھڑے

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہُوا ہے موج سے ملّاح جس کا گرمِ ستیز

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِّ نظر سے دُور ہوگئی

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(اقبال)

علیگڈھ کالج سے رخصت

زمانۂ طالب علمی کی یادگار

دم بھر کی جسے فرصت یہ چرخِ ستمگر دے
وہ شخص تو البتہ یاں عیش منائیگا

صحبت سے اگر اپنے اوروں کو کریگا خوش
احباب کی صحبت کا کچھ لطف اٹھائیگا

اصرار سے اوروں کے گر توڑ کے تقویٰ کو
میخانہ کی صحبت کا اک جام چڑھائیگا

کاہے مے گلگوں سے دو ایک سبو بھر کر
خود پیرِ مغاں بن کر اوروں کو پلائیگا

گر پچھلے زمانے کا چھڑ جائیگا کہیں قصہ
اوروں کی سُنیگا کچھ، کچھ اپنی سنائیگا

صحبت میں اگر اُن کی بھولیگا کچھ اپنے غم
کچھ رنج و محن اُن کے بھی دل سے مٹائیگا

لیکن۔ طے کرنا ہو صبح کو اک منزل
اُس شخص کا محفل میں کیوں دل نہ بھر آئیگا

کس طرح سے صحبت سے محظوظ ہو اس کا دل
احباب سے کل جس کو یہ چرخ چھڑائیگا

ہو گونجتی کانوں میں آوازِ جرس جس کے
وہ اپنی [illegible] اوروں کو [illegible]

ساقی کی ظرافت سے مسرور ہو وہ کیونکر
پو پھٹتے ہی جس کا یاں سے قافلہ جائیگا

مے ہوئے کہ نغمہ ہو۔ فرصت میں ہیں سب اچھے — دم بھر کا جو مہمان ہے کیا لطف اٹھائے گا

ہم جاتے ہیں اے کالج پر یاد رہے اتنا — یاد آئیگی جب تیری تو خوں رلائے گا
اس بلبل بیکس کو جو قید قفس میں ہو — کیا اس کو گل گلشن پھر یاد نہ آئے گا
دل رکھتے ہوا ہے یارو تو کہدو خدا لگتی — کیا تم سے الگ رہنا کچھ دل نہ دکھائے گا
سیکھی تھی محبت جو یاں آٹھ برس رہ کر — جو ہر اسے کس طرح پھر دل سے بھلائے گا
جس حال میں ہم ہونگے ایک حشر بپا ہوگا — ایام گذشتہ کا دھیان جب آئے گا
کالج کے لئے لیکن نکلیگی دعا دل سے — ہر بار زبان پر یہ مطلع مگر آئے گا

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
داتا رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

مسٹر محمد علی صاحب جوہر بی۔ اے

غزلیات

شفا سے کیا غرض اے چارہ گر بیمار جاناں کو — مجھے یہ درد ہی اچھا ہے رہنے دیجئے درماں کو
جلایا ہے وہ خرمن آپ کی برق تبسم نے — کہ حسرت جس پہ گرنے کی رہی ہر برق تاباں کو
بلا کے من چلے مردان میدان جنوں دیکھے — کیا آباد جا کر کوہ کو صحرا کو زنداں کو
سیہ مستی ہے ان میں بھی ترے گیسوئے سرکش کی — کوئی دیکھے ترے سودائیان پا بجولاں کو
ادھر نہایت عنایت کی ادھر پایان مجبوری — دکھاؤں کس طرح صورت نگاہ لطف جاناں کو
رہیں گے دل کے دل میں یہ نہ نکلے ہیں نہ نکلیں گے — نہ ٹوکو میری حسرت کو نہ چھیڑو میرے ارماں کو
کوئی ایسا تو دل لیں جس کی قیمت آپ کا دل ہو — کرینگے آپ کیا اس میرے دل کی جنس ارزاں کو
یہ نیرنگی ہے سب نیرنگ کی تقدیر کی ورنہ — ترے کوچے کے گلشن سے کوئی کیوں جائے گلشن کو

نیرنگ

زمانہ دیکھیگا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان اپنی
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان آبرو کا

نہ ہو طبیعت ہی جنکی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا اتنا بے درد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی غبار تھا کوئے آرزو کا

ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھکر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

اُٹھایا ذوقِ تپش پتنگے نے شمع سے شوقِ اشکباری
کہیں سے سیکھی نماز پینے لیا کہیں سے سبق وضو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

جو چاک تیرے جگر کو دیکھے کلی نے بادِ صبا سے پوچھا
یہ آدمی ہے کہ گل ہی منت پذیر ہے سوزنِ رفو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کسکو یارا ہے گفتگو کا

تمام مضموں مرے پُرانے کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جُو کا

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

اقبال

ازل سے ہوں محوِ تماشا کسی کا
نگاہوں میں پھرتا ہے جلوا کسی کا

جگر تھام کر آپ بیٹھیں تو پہلے
ہنسی کھیل ہے کچھ تڑپنا کسی کا

تمہیں تو تسلی تشفی کرو گے
تمہیں سے تو ہوگا مداوا کسی کا

سدھاریں بھلا آپ کیا دیکھتے ہیں
جنازہ کسی کا تماشہ کسی کا

عدو اور تم سے ملے بیغرض وہ
نہ کھلواؤ بس ہم سے پردا کسی کا

سبحان اللہ تم نے اجل نے جلایا
کہیں کام رکتا ہے داتا کسی کا

مجھے یاد ہے میں نہ بھولونگا شاعر
وہ ہنس ہنس کے منہ پھیر لینا کسی کا

بُتوں کی یاد سے کہدو جو دل میں تو آئے
خدا کا گھر ہے کہتے ہیں باوضو آئے

نہ سمجھے تھے کہ یہ عالم ہے خانۂ حرماں
ہزاروں لے کے عبث دل آرزو آئے

سنوں میں خاک پسِ پردہ لن ترانی کو
جسے ہو حُسن کا دعویٰ وہ روبرو آئے

ہزار شکر کہ قاتل کے رُعبِ تیغ سے ہم
سپید رو گئے مقتل سے سُرخرو آئے

دماغ دے جو خدا گلشنِ محبت میں
ہر ایک پھول سے تیری قبا کی بُو آئے

پسِ فنا ہے وُہی رابطہ حسینوں سے
فرشتے گور میں بھی بن کے خوبرو آئے

زباں دراز سناں زخم ہیں دریدہ دہن
کہیں نہ دونوں میں رنجش کی گفتگو آئے

خدا کرے کسی نا آشنا ستمگر پر
ہماری طرح ترا دل بھی تند خو آئے

مزہ تو جب ہے شہادت کا میں اِدھر سے بڑھوں
اُدھر سے تیغِ ستم چل کے تا گلو آئے

جیئے وہ خستہ جگر کیا کہ جس کی آنکھوں سے
گھڑی گھڑی عوضِ اشک تر لہو آئے

کمال دل کو تنفر ہے ہجر میں ساقی
نہ شیشہ آئے نہ آگے مرے سبو آئے

عدم سے صورتِ اشکِ چکیدہ وائے نصیب
ڈبونے بحرِ محبت میں آبرو آئے

دکھائیں حُسنِ بیان شاعری میں کیا تسلیم
زبان آئے نہ اندازِ گفتگو آئے

تسلیم

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تیری پستی
روانی بحر میں اُفتادگی تیری کنارے میں

جو نکلا نالہ بن کر غنچۂ منقارِ بلبل سے
وہی نکہت چمن سے اُڑ کے جا چمکی ستارے میں

مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا
تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

اُتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو
ملا وہ لُطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چُھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنس ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو — وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
نہاں تھا تو تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا — مگر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں
سکوں ناآشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے — تڑپ کس دل کی یا رب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

اقبال

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے — بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسینگے — برہنہ پائی وہی رہیگی مگر نیا خار زار ہوگا
سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر — جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جسنے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا — سنا ہے یہ قدسیوں سے میںنے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں — تو پیرِ مے خانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی! — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا — ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا
جنوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستانِ صدا کیا جا! — مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو — یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
یہ ایک تماشائے نگاہ تونے ہزار کرکے ہمیں دکھایا — یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا
کہا جو قمری سے میںنے اکدن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں! — تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنونگا جسکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبشِ نظر بھی — رہیگی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لیکے نکلونگا اپنے درماندہ کاروانکو — شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا!
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا — تو اک نفس ہے جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سرِ رہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(اقبال از کیمبرج)

تری تصویر کو ہم دیکھ لیا کرتے ہیں — یوں ہی تسکینِ دلِ زار کیا کرتے ہیں
کام یہ صبح کو اُٹھتے ہی کیا کرتے ہیں — ہم دُعائیں تجھے لاکھوں ہی دیا کرتے ہیں
آہ آغوشِ حقیقی تو کہاں اپنا نصیب — ہاں تصور میں تجھے کھینچ لیا کرتے ہیں
دیکھتے دیکھتے پیار آتا ہے۔ تو آنکھوں سے — ہم بلائیں ترے مکھڑے کی لیا کرتے ہیں

کبھی کُڑھنا۔ کبھی رونا۔ کبھی آہیں بھرنا
کوئی جینا ہے یہ ؟ کیا خاک جیا کرتے ہیں

گمنام

اِک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے جب دھیان تمہارا آتا ہے — چُپکے چُپکے روتا ہوں دم گھُٹتا ہے جی گھبراتا ہے
پُرنم مژگاں دیکھ کے میری یہ کہتے ہیں وہ ہنس ہنس کر — یہ برسے دیکھیں تو سہی کیا کیا موتی برساتا ہے
آنکھیں کھولو کھُل کھیلو شبِ وصل کی گزری جاتی ہے — شوخی وہ تمہاری کیا ہوئی آج اتنا بھی کوئی شرماتا ہے
غماز۔ رقیب اِک ہی تھیلی کے دونوں چٹے بٹے ہیں — یہ بھی اُس کو شہ دیتا ہے وہ بھی اُسے بہکاتا ہے
انصاف تو یہ ہے میرے لئے، تم سے تو تمہارا دھیان اچھا — فرقت میں تم تڑپاتے ہو یہ آکے مجھے بہلاتا ہے
سارے گاہک سودا لیکر جاتے ہیں افسوس اپنے گھر کو — ہم نے دُکان لگائی اب بازار جب اُٹھا جاتا ہے
لاکھوں خُم ہیں، لاکھوں شیشے ہیں سب بھر بھر کے — تجھکو ہی کمی کیا؟ اے ساقی! ناحق جو مجھے ترساتا ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی سانس میں میری آتی ہے اُنکی لب پہ ہنسی — چلتی ہے نسیم چمن میں جب، فوراً غنچہ کھل جاتا ہے
اِس رَٹ نے اُنکی، وصل میں بھی، جی بھر کر پیار نہ کرنے دیا — ہٹ کر بیٹھو، کہنا مانو، دیکھو وہ کوئی آتا ہے
غم، غصہ روزِ ازل ہی سے عاشق کی غذا چلی آتی ہے — روکھا سوکھا کھا لیتا ہوں جو کچھ کہ میسر آتا ہے

کیوں چپ ہے خیال اب سوچ ہے کیا؟ کیسی دھن ہے؟ کس کی دھن ہے
یہ حال ہے کیا؟ کچھ کہ تو سہی، یاروں سے بھی کوئی چھپاتا ہے

مولوی ریاض حسن خاں، خیال

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں　　کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانبِ دیر　　کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

ستایا آ کے پہروں آرزو نے　　جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں

نہ تھا مَیں معتقد اعجازِ مے کا　　بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم　　مَیں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں مُنہ چھپائے　　بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

کجا مَیں اور کجا اے شادؔ دنیا

کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

(شادؔ)

رکھنا خمِ گیسو میں یا دل کو رہا کرنا　　کچھ کہہ تو سہی ظالم آخر تجھے کیا کرنا

آتا ہے سوا اس کے اور آپ کو کیا کرنا　　اپنوں کو بُرا کہنا۔ غیروں کا بھلا کرنا

مجھ سے ہی جُدا رہنا۔ مجھکو ہی جُدا کرنا　　پھر اُس پہ یہ طُرّہ ہے میرا ہی گلا کرنا

اب قتل مجھے کرنا۔ یا عفوِ خطا کرنا　　منظور ہے جو کرنا۔ پھر سوچ ہے کیا کرنا

آئینہ میں عکس اپنا دیکھا تو کہا مجھ سے　　دونوں میں ہے کون اچھا انصاف ذرا کرنا

بوسہ بھی مجھے دینا۔ ہونٹوں میں بھی کچھ کہنا　　جینے کی دوا دینا۔ مرنے کی دُعا کرنا

دل تو نہ مرا توڑو۔ وعدہ تو ذرا کر لو　　چاہو تو وفا کرنا۔ چاہو نہ وفا کرنا

کیوں ہوتے ہوئے میرے اوروں سے غرض رکھّو　　مجھ پر ہی ستم ڈھانا۔ مجھ سے ہی وفا کرنا

ہم سے ہی وعدے تھے۔ ہم سے ہی پیماں تھے　　یُوں مِل کے دغا دینا یُوں مِل کے دغا کرنا

کیا مجھ سے زیادہ ہے پابندِ وفا کوئی　　ایمان سے تم کہنا۔ انصاف ذرا کرنا

جاتے ہو جو گھر جاؤ پر وعدہ یہ کر جاؤ　　مَیں یاد جب آجاؤں۔ مرنے کی دُعا کرنا

ہے غیر کے ماتم میں یہ آہ و فغاں ناحق　　اب مجھ پہ کرم کرنا۔ اب مجھ سے وفا کرنا

رُک رُک کے یہ مِلنا کیا مِل مِل کے یہ رُکنا کیا　　کیوں کھُل کے نہیں کہتے آخر تمہیں کیا کرنا

وہ ہم سے جو کھنچ بیٹھے۔ قسمت کی یہ خوبی ہے　　بیکار ہے غم کھانا بیجا ہے گِلا کرنا

اُن کو ہے اُدھر یہ ہٹ پامال کریں اِس کو　　دل کو ہے اِدھر یہ ضد۔ اُن کا ہی کہا کرنا

میں وہ کہ مجھے مشکل دل دے کے جو پھر مانگوں　　تم وہ کہ تمھیں آساں دل لے کے دغا کرنا

ترچھی تری چتون نے لاکھوں کیے بسمل　　اے ترک ترا ناوک کیا جانے خطا کرنا

دل تم کو یہ نہیں دینگے کیا عہدِ وفا لیں گے　　تم جور و جفا کرنا یا عہدِ وفا کرنا

ہے وصل کی شب تم کو افسوس حجاب اپنا　　کس شرع میں جائز ہے خلوت میں حیا کرنا

صیاد مرا یارب پھندے میں پھنسا کس کے　　ہر ایک سے کہتا ہے اب چاہیے کیا کرنا

یاں وعدہ وفا ہوگا یا حشر پہ رکھو گے　　میں بھی تو سنوں تم کو منظور ہے کیا کرنا

دشوار ہے اُتنا ہی دل کا مجھے سمجھانا　　جتنا تمھیں مشکل ہے وعدے کا وفا کرنا

نعش اُٹھتی ہے دشمن کی دے آؤ اسے مٹی　　پھر آہ کیا کرنا۔ پھر ہاتھ ملا کرنا

سہتے بھی جفا اُن کی کرتے بھی وفا اُن سے　　دل کی بھی خوشی کرنی اُن کا بھی کہا کرنا

قرباں میں عصیاں کے بخشش کی ملی دولت　　صد شکر کہ محشر میں کام آیا خطا کرنا

بیداد کا اب شکوہ بیجا ہے نسیم اُن سے
تھا تم کو محبت کا اظہار ہی کیا کرنا

نسیم بھرتپوری

کیا بیاں کیجئے محبوب کی ہوشیاری کا　　پا کے دیوانہ بڑا بوجھ مرے سر مارا

چار آنکھوں کی مروّت نے بھی مارا مجھ کو　　دل نے لے لینے پہ اُس وقت ابھارا مجھ کو

سچ بتا دوں مجھے اُس وقت یہ آیا تھا خیال　　یار کے کام سے منکر ہیں سب افلاک و جبال

تو بھی اِس وقت جو انکار کی کہہ جائے گا　　لیکے مُنہ اپنا سا دلدار نہ رہ جائے گا

بات پیارے کی رہے پاس مروّت یہ ہے　　سر پہ لے لیجئے آفت ہی جو آفت یہ ہے

وہ بھی کیا جان ہے جو دوست پہ قرباں نہ جائے　　جان جائے تو چلی جائے مگر آن نہ جائے

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

ناطق

مانا تمام خلق سے تو بے نیاز ہے　　تیرا نیاز مند ہوں یہ مجکو ناز ہے

اُٹھ جائے بزمِ مے سے جو بے امتیاز ہے　　خلوت پسند صحبتِ افشائے راز ہے

تیرے فقیر دولت طاعت سے ہیں غنی　　داغ سجود دِرہم اہلِ نماز ہے

شاید یہ نردبان ہو بامِ وصال کا　　عالم تمام کوہ و نشیب و فراز ہے

سرمایۂ غنا ہے ترقی احتیاج　　جو فقر میں فنا ہے وہی بے نیاز ہے

وہ محوِ رنگ خندہ ہے یہ محوِ ذاتِ گل　　بلبل میں اور غنچہ میں یہ امتیاز ہے

کیوں سدِ راہ میکدہ ہوتا ہے محتسب　　پوچھو کہ بند ہے کہ درِ توبہ باز ہے

تکلیف ہے وطن میں زیادہ سفر میں کم　　نکلو تو عین راہ میں قصرِ نماز ہے

قائل ہے نیک و بد میں تجلی حُسن کا
کاشف کی کیا سند کہ وہ بے امتیاز ہے

کاشف غازیپوری

نہیں چین اگرچہ بے مے شبِ ماہتاب ہرگز　　نہ پلائے خود جو ساقی نہ پیوں شراب ہرگز

شبِ وصل میں ہو یارب شبِ ہجر کی درازی　　کہ طلوع تا قیامت نہ ہو آفتاب ہرگز

جو خطا ہوئی ہے مجھ سے وہ ترے سبب ہوئی ہے　　نہ کرے جو تو تغافل نہ ہو اضطراب ہرگز

یہ مزہ شکستگی کا مجھے عمر بھر نہ بھولے　　دلِ کام جو الٰہی نہ ہو کامیاب ہرگز

جو خدا نے دی ہیں آنکھیں تو کچھ اُن سے کام بھی لے　　ہمہ داں بنا سکے گی نہ تجھے کتاب ہرگز

مرے دل میں اے شبِ غم تو چھری چبھو خلش کی　　کہ نہیں ہے چشمِ عاشق پئے ذوقِ خواب ہرگز

یہ ضرور مجھکو وحشت لکھوں خط پہ خط میں اُن کو
اُنہیں ضد کہ ایک کا بھی نہ لکھیں جواب ہرگز

وحشت